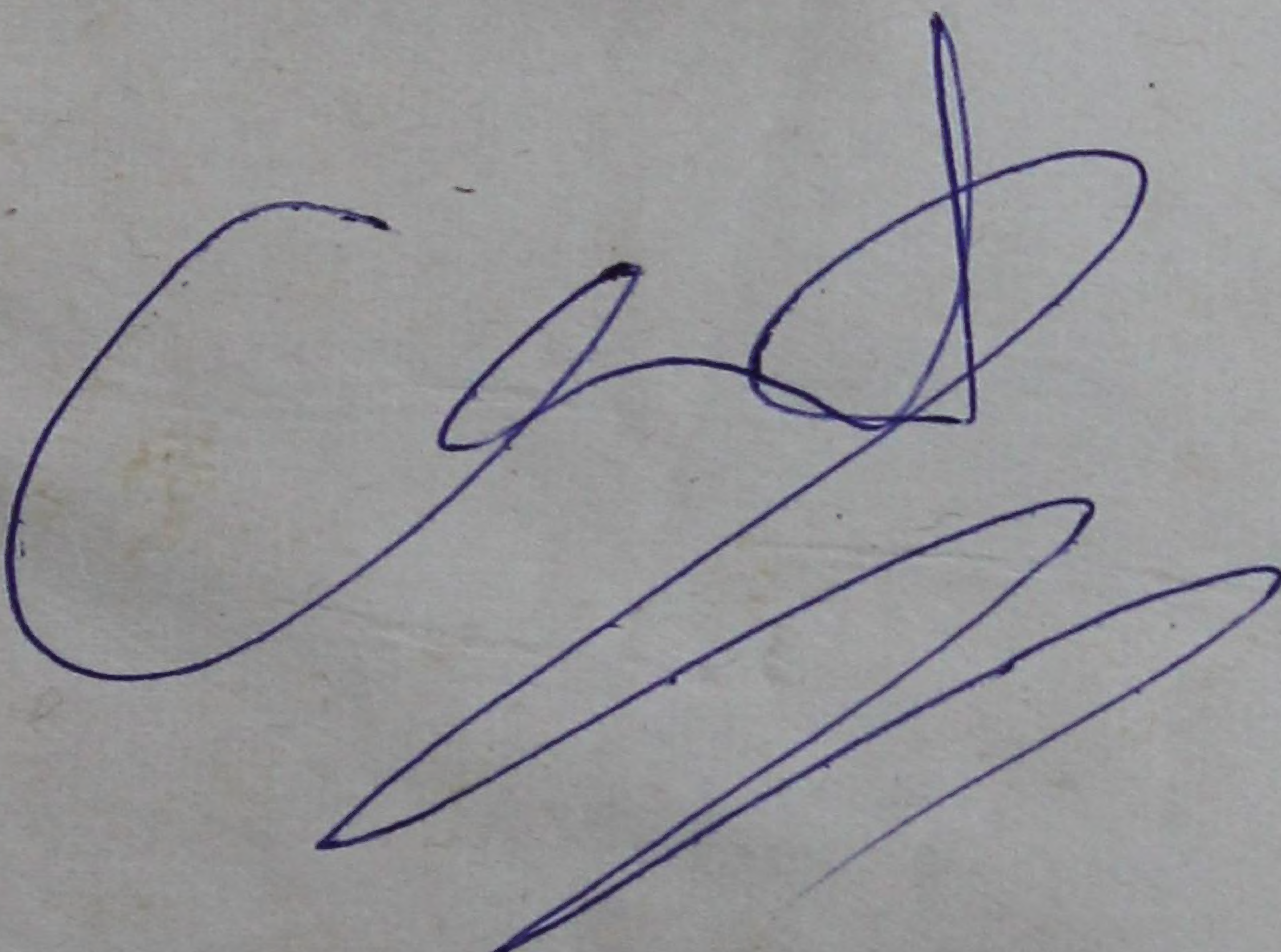


منتخب اسالیب

مرتبہ

صغیر احمد جان، ایم، اے (الہ آباد و دہلی)
شعبہ اردو و فارسی
کمرس کالج دہلی

فرینک برادرس اینڈ کمپنی - چاندنی چوک دہلی

بار اول   سنہ ۱۹۴۶ء   قیمت ۸ر

(مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی)

دیباچہ

اُردو نثر کی عمر پانچسو سوا پانچسو سال سے زیادہ نہیں ہے اور پھر اسی قلیل مدّت میں ابتدائی چار سو سال بھی شامل ہیں جو اردو زبان و ادب کے بچپن اور لڑکپن کا عہد ہے جس میں اُردو غوُں غاں کرنا سیکھتی ہے۔ باقی رہے کچھُ کم ڈیڑھ سو برس۔ اس مدّت کو اُردو نثر کے ہوش کا زمانہ سمجھ لو چاہے عہد شباب کا واقع یہ ہے کہ اُردو کے دامن میں جو کچھ سرمایہ نظر آتا ہے وہ اسی عہد کی کمائی ہے۔

ہمیں یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ کہ اُردو ادب نے اس قلیل مدّت میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور اس کا خزانہ گوناگوں اسالیب بیان سے مالا مال ہو گیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں کسی زبان کے ادب کی وسعت کتابوں کی کثرت تعداد پر منحصر نہیں ہوتی۔ بلکہ اسالیب بیان کی کثرت اور بوقلمونی سے اس کی وسعت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اگر اس معیار کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر اُردو نثر کی وسعت و پہنائی کے بارے میں ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔

مطالعہ ادب کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ مطالب جذبات و خیالات جو اس میں ادا کئے گئے ہیں انہیں سمجھ لیا جائے اور جو نئے الفاظ استعمال ہوئے ہوں ان کے معنی

دوسرا اسی بات کو تشبیہ کے رنگ میں رنگ کر استعارہ کی بو میں بسا کر پیش کرتا ہے اور اسی طرح دونوں کے اسلوب میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ بے شک اسلوب بیان کا یہ مطلب ایک حد تک صحیح ہے۔ مگر کافی نہیں ہے۔ اس مطلب کو پورا کرنے کے لیئے "مصنّف کے نقطہ نظر" اور "افتاد طبع" کو اور شامل کرنا پڑے گا۔ اور پھر اسلوب بیان کی تعریف ان الفاظ میں کی جائے گی کہ "کسی انشا پرداز کی افتاد طبع اور مخصوص نقطہ نظر کو جب الفاظ کا جامہ پہنایا جاتا ہے تو جس پیرائے میں مطالب ادا ہوتے ہیں وہ اُس کا اسلوب بیان کہلاتا ہے۔ الفاظ و تراکیب کا مخصوص استعمال نتیجہ ہوتا ہے۔ انشا پرداز کی افتاد طبع اور مخصوص نقطۂ نظر کا۔ سادگی و رنگینی، متانت و سنجیدگی۔ شگفتگی و شوخی۔ تصنع و آورد آمد و روانی وغیرہ پیدا نہیں کی جاتیں بلکہ خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ تشبیہ و استعارہ استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ خود بخود استعمال میں آجاتا ہے۔ الفاظ و تراکیب کو مطالب کی مطابقت کے لیئے انتخاب نہیں کیا جاتا۔ بلکہ انشا پرداز کی افتاد طبع و نقطہ نظر کے تقاضے سے وہ خود بخود آتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ نگینوں کی طرح بیٹھتے جاتے ہیں۔

مطالعہ ادب کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ مصنّف و انشا پرداز کی شخصیت کو سمجھ کر اس کی بلند سطح تک اٹھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ اس مقصد کے لیئے نہایت ضروری

ذہن نشین کر لیے جائیں۔ افسوس کہ عام طور پر خصوصاً اسکولوں اور کالجوں میں یہی منتہائے کمال سمجھا جاتا ہے۔ درحقیقت مطالعہ ادب اسالیب بیان کا مطالعہ ہے۔ اسلوب بیان کا مطالعہ ہمیں مُصنّف تک باریاب ہونے کا موقع دیتا ہے اور اس کی شخصیت کو سمجھنے میں ممد ہوتا ہے۔

جس طرح شاعری کے لئے مواد سے زیادہ ندرت بیان ضروری ہے۔ اسی طرح انشا پردازی کے لئے مطالب و خیالات سے زیادہ اسلوب بیان کی خوبی اہم ہوتی ہے۔ انشا پردازی اہم مطالب اور وقیع موضوع کی محتاج نہیں ہوتی۔ معمولی سے معمولی خیال اور حقیر سے حقیر شے عمدہ اور دلچسپ موضوع بن سکتی ہے انشا پردازی کے لئے سب سے پہلی اور آخری چیز اسلوب بیان کی خوبی ہے۔ اسی اسلوب سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے اسی اسلوب سے اثر پیدا ہوتا ہے اور یہی اسلوب ایک شخصیت کو دوسری شخصیت سے ممتاز کرتا ہے۔

اسلوب بیان جس کی یہ کچھ اہمیت بیان کی گئی۔ آخر ہے کیا چیز؟ اس سوال کا صحیح جواب قدرے مشکل ہے۔ چلتا ہوا جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ کسی مطلب کو ادا کرنے کا کوئی خاص طریقہ اسلوب بیان کہلاتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلوب بیان کی بنیاد الفاظ و تراکیب کے مخصوص استعمال پر ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی بات کو صاف و سادہ الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔

ہے کہ اس کے اسلوب بیان کو سمجھ کر اس کی خوبیوں سے لُطف اندوز ہوا جائے۔ جو طلبہ خود انشا پرداز بننا چاہتے ہیں گو اُن کے لئے کسی مسلم الثبوت انشا پرداز کے اسلوب بیان کی تقلید ضروری نہیں۔ تاہم متعدد اسالیب کا مطالعہ اور اُن کی خصوصیات کو ذہن نشین کرنا نہایت مفید ہے کسی مفید ترین اور بہترین اسلوب کی تقلید بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اسلوب کا انتخاب خود طلبہ کے ذوق کو کرنا چاہئے کسی خاص انشا پرداز اور اس کے اسلوب کو بہترین بتا کر طلبہ کی رہنمائی نہیں کی جا سکتی۔ یہ ضروری نہیں کہ میری پسند آپ کی پسند اور میرا ذوق حسُن آپ کا ذوق حسُن ہو۔ لہذا پسند کرنے اور پرکھنے کے معاملے میں طلبہ کو کافی آزادی دینی چاہیے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان کی رہنمائی بھی ضروری ہے۔ اس کی بہترین صورت یہ ہو سکتی ہے کہ چند مسلم الثبوت انشا پردازوں کے اسالیب کے مطالعہ کا موقع انہیں دیا جائے وہ ہر اسلوب پر غور کریں۔ اس کی خصوصیات سے لُطف اندوز ہوں اور پھر اپنے ذوق کی ہدایت میں کسی ایک یا متعدد اسالیب کو منتخب کر لیں +

اس مقصد کو پورا کرنے کے لیۓ ناچیز راقم الحروف نے چند مسلم الثبوت مُصنفین کو جن کا مطالعہ طلبہ کے لئے واقعی مفید ہے۔ چُن لیا ہے۔ اور اپنی دانست میں اُن کے رشحات کا ایسا انتخاب کیا ہے جو اُن کی خصوصیات

کو کما حقہ واضح کرتا ہے +

ہر انتخاب کے شروع میں طلبہ کی واقفیت اور دلچسپی کے لئے مصنف کے مختصر حالات درج کر دئے ہیں اور اُس کے اسلوب بیان کی اہم خصوصیات بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں اس اسلوب کا مناسب مصرف بھی بتایا گیا ہے تاکہ طلبہ کو خود اپنے لئے کسی اسلوب کے انتخاب کرنے میں مغالطہ نہ ہو +

حواشی کو آخر میں ڈال دیا گیا ہے۔ مشکل الفاظ کے معنی و تشریح کے لئے طلبہ کو لغات سے مدد لینے کی عادت ہونی چاہیئے۔ البتہ بعض مشکلات ایسی حائل ہوتی ہیں جن کا حل لغات میں عموماً نہیں ملتا۔ حواشی میں صرف اسی قسم کی مشکلات کو حل کیا گیا ہے +

پیش نظر مجموعہ منشورہ یعنی "منتخب اسالیب" کا ڈھانچہ مدت سے ذہن میں بہ مشکل تصور موجود تھا۔ شکر ہے۔ کہ اب یہ قوت سے فعل میں آ گیا ہے۔ اس گلدستہ کو میں اس توقع پر پیش کرتا ہوں کہ یہ گلہائے رنگا رنگ طلبہ کے ذوق ادب کی رہنمائی کر کے اُسے راہ راست پر لگا دیں گے۔ اگر اس مقصد میں کامیابی ہوئی تو میری کوشش مشکور ہو گی ورنہ رائیگاں +

خاکسار

صغیر احمد جان۔ کمرس کالج دہلی

فهرست لغات

صحیفه	لغت	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

۱۔ فسانہ شاہ یمن

سلطنت سائل کو دینا۔ اور بی بی کو مع بیٹوں کے لیکر شہر سے باہر نکلنا۔ راہ میں سوداگر کا فریب۔ پھر فرزند کی جدائی۔ آخر سلطنت ہاتھ آئی۔

(مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی)

مرزا رجب علی بیگ نام۔ سرور تخلص۔ مرزا اصغر علی لکھنوی کے بیٹے۔ ۱۷۸۶ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ اور لکھنؤ ہی میں تعلیم و تربیت پائی۔ عربی فارسی کے عالم تھے شاعری میں آغا نوازش حسین نوازش کے شاگرد تھے مذاق سخن ستھرا تھا۔ لیکن شہرت نثر نگاری کی وجہ سے ہوئی۔ آپ کا انتقال ۱۸۶۷ء میں بنارس میں ہوا۔ سرور کی تصانیف یہ ہیں :۔ (۱)۔"فسانۂ عجائب"۔

(۲) سرور سلطانی (۳) گلزار سرور (۴) شگوفۂ محبت۔
(۵) اِنشائے سرور +

جملہ تصانیف میں "فسانۂ عجائب" جس سے افسانہ ذیل یعنی "فسانۂ شاہ یمن" لیا گیا ہے۔ اپنے رنگ کی بہترین تصنیف ہے۔ یہ افسانہ ۱۸۲۵ء میں گویا آج سے سو برس پہلے لکھا گیا تھا +

سرور مقفّٰی اور مسجّع عبارت لکھتے ہیں۔ یہ رنگینی اور قافیہ پیمائی فارسی کا رنگ تھا۔ لیکن اُردو میں اس رنگ کو باقاعدہ سرور ہی نے ایجاد کیا اور برتا +

مقفّٰی اور مسجّع نثر کی بنا تصنع اور بناوٹ پر ہوتی ہے۔ اور اس کی دلآویزی کا مدار مصنوعی حسن پر ہوتا ہے۔ اس میں تو شک نہیں۔ کہ یہ رنگ پڑھنے اور دیکھنے میں آج بھی پُر لطف ہے۔ لیکن اس طرز نگارش کا میدان اس قدر تنگ ہے۔ کہ اس میں بجز افسانہ گوئی کسی علمی اور ادبی بحث کی قدرت نہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ یہ اسلوب بیان اب قطعی متروک ہے۔ یہاں تک کہ قصہ کہانی میں بھی اس طرز کو کوئی اختیار نہیں کرتا +

اس خوبصورت اور شاعرانہ طرز کو آخر کیوں ترک کر دیا گیا؟ کیا اس لئے کہ اس رنگ کا برتنا بہت مشکل ہے؟ یاد رکھئے۔ کہ اس اسلوب کو ترک کر دینے

کی حقیقی وجہ صرف اس کے دامن کی تنگی ہے۔ موجودہ عہد کا افسانہ جسے اب ناول کہنا چاہیئے۔ اِس طرز میں لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ قدیم افسانہ کی بنیاد فوق الفطرت عناصر پر ہوتی ہے۔ اس میں جتنے عجائب و غرائب دکھائے جائیں۔ جس قدر مبالغہ کیا جائے۔ روا ہے۔ لیکن موجودہ افسانہ حیات انسانی کے گہرے مطالعہ سے بنتا ہے۔ اِس میں واقعات سے بحث کی جاتی ہے۔ نہ عجائب و غرائب سے سروکار ہوتا ہے۔ نہ مبالغے کی گنجائش۔ قدیم افسانہ کی تصنیف کے لئے شاعرانہ انہماک و ازخود رفتگی درکار ہے۔ اور موجودہ افسانہ کے لئے واقعات اور جذبات و احساسات کا عمیق مطالعہ۔ اُس کے لئے تشبیہ و استعارہ کی تلاش اور قافیہ و سجع کی جستجو کی ضرورت ہے۔ اور اِس کے لئے محض صداقت بیان کی۔ ظاہر ہے۔ کہ سچے واقعات کی سچی تصویر صرف نثر عاری ہی میں پیش کی جا سکتی ہے؂

با ایں ہمہ اس طرز نگارش کو سمجھنا اور اس سے لطف اندوز ہونا اُردو ادب کے طلبہ کے لئے ناگزیر ہے؂

سرزمین یمن میں ایک بادشاہ تھا۔ ملک اس کا مالا مال۔ دولت لازوال۔ بخشیدۂ تاج و تخت۔ نیک سیرت فرخندہ بخت۔ جس دم سائل کی صدا گوش حق نیوش

میں در آئی۔ وہیں احتیاج پکاری "میں بر آئی"۔ یہاں تک کہ لقب اس کا خدا دوست نزدیک و دور مشہور ہوا +
ایک روز کوئی شخص آیا۔ اور سوال کیا۔ کہ "اگر تو خدا دوست ہے۔ تو للہ تین دن مجھے سلطنت کرنے دے"۔ بادشاہ نے فرمایا "بسم اللہ"۔ جو رُکن سلطنت مسند نشین حکومت حاضر تھے۔ بتاکید اُنہیں حکم ہوا۔ کہ جو اس کی نافرمانی کرے گا۔ موردِ عتاب سلطانی ہوگا۔ یہ کہہ وہ فرمانبروار تخت سے اٹھا۔ سائل جا بیٹھا۔ اور حکمرانی کرنے لگا۔ چوتھے روز بادشاہ آیا۔ کہا۔ کیا قصد ہے؟ سائل بولا "پہلے تو وہ فقط امتحان تھا۔ اب بادشاہت کا مزا ملا۔ برائے خدا تاج و تخت مجھے یک لخت بخش دے"۔ بادشاہ نے فرمایا۔ کہ "یہ حکومت آپ کو مبارک ہو"+
بادشاہت دے کر کچھ نہ ہیہات لیا۔ فقط لڑکوں کا ہاتھ میں ہاتھ۔ بی بی کو ساتھ لیا۔ دل کو سمجھایا۔ کہ اتنے دنوں سلطنت کی۔ حکومت کی۔ چندے فقیری کی کیفیت فاقے کی لذت دیکھئے۔ گو جاہ و حشم مفقود ہے۔ مگر شاہی بہر کیف موجود ہے۔ اس شہر سے کہیں اور چلنا فرض ہے۔ حکم خدا قُل سیروا فی الارض ہے۔ دُنیا جائے دید ہے۔ عنایت خالق سے کیا بعید ہے۔ جو کوئی اور صورت نکلے۔ ایک

لڑکا سات برس کا۔ دوسرا نو برس کا تھا۔ غرض کہ وہ حق پرست شہر سے تہی دست نکلا۔ بلکہ تکلّف کا لباس بھی نہ لیا۔ جامۂ عریانی جسم پر چست کیا اور چل نِکلا ؛

دُنیا کا زور نقشہ ہے۔ مصرعہ ؎

کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است

کل وہ سلطنت ثروت۔ کرّ و فر۔ افسر و تاج۔ آج یہ مصیبت۔ اذیت۔ در بدر۔ پیادہ پا سفر۔ محتاج۔ کبھی دو کوس۔ کبھی چار کوس۔ بے نقارہ و کوس۔ بہزار رنج و تعب چلتا۔ جو کچھ میسّر آتا۔ تو روزی ہوتی۔ نہیں تو روزہ ؛

یوُں ہی ہر روز راہ طے کرتا۔ جب یہ نوبت پہنچی۔ چند روز میں ایک شہر ملا۔ مُسافر خانے میں بادشاہ اُترا۔ اتفاقاً ایک سوداگر بھی کِسی سِمت سے وارد ہوُا۔ قافلہ باہر اُترا۔ آپ ہوُا کے گھوڑے پر سوار سیر کرتا ہوُا مہماں سرا میں وارد ہوُا۔ شہزادی گو کہ گردِ راہِ صعوبتِ سفر میں مبتلا تھی۔ لیکن اچھی صورت کبھی چھپی نہیں رہتی۔ سعدی ؎

حاجت مشاطہ نیست روئے دلآرام را

سوداگر کی جو آنکھ پڑی۔ بیک نگاہ از خود رفتہ ہوُا۔ بادشاہ کے قریب آکے سلام کیا۔ یہ بیچارے اللہ کے

ولی - وہ نابکار شقی - بادشاہ نے سلام کا جواب دیا۔
وہ غدار حیلہ جو بہت افسردہ خاطر ہو کر بولا "اے
عزیز! میں تاجر ہوں - قافلہ باہر اُترا ہے - میری
عورت کو دردِ زہ ہو رہا ہے - دائی کی تلاش میں دیر
سے گدائی کر رہا ہوں - ملتی نہیں - تو مردِ بزرگ ہے
کج ادائی نہ کر - اِس نیک بخت کو للّٰلہ میرے ساتھ
کر دے - کہ اس کے واسطہ سے اُس کو نجات ملے
وگر نہ ایک بندۂ خدا کا مُفت خُون ہوتا ہے" ۔
یہ اللہ کا نام سُن کر گھبرائے - بی بی سے کہا -
"زہے نصیب جو محتاجی میں کسی کی حاجب رفع ہو
کام نکلے - بسم اللہ - دیر نہ کر" اس نے دم نہ مارا۔
سوداگر کے ساتھ روانہ ہوئی ۔
دروازے سے باہر نِکل اُس غریب سے کہا "قافلہ
دُور ہے - مجھے آئے ہوئے عرصہ گذرا ہے - آپ
گھوڑے پر چڑھ لیں - تو جلد پہنچیں" وہ فلک کی
ستائی فریب نہ جانتی تھی - سوار ہوئی - سوداگر نے
گھوڑے پر بیٹھا باگ اُٹھائی - قافلے کے پاس آ کوچ
کا حکم دیا - آپ ایک سِمت گھوڑا پھینکا - اُس وقت
اِس نیک بخت نے داد بیداد فریاد مچائی - تڑپی - روئی
پیٹی - چلائی - آہ و زاری اُس کی اِس بے رحم سنگدل
کی خاطر میں نہ آئی ۔

بادشاہ پہر بھر منتظر رہا۔ پھر خیال میں آیا۔ خود چلیے دیکھیے وہاں کیا ماجرا ہؤا۔ بیٹوں کا ہاتھ پکڑے سرا سے نِکلا۔ ہر چند ڈھونڈا۔ نِشان کے سوا قافلے کا نِشان نہ مِلا۔ دُور گرد اڑتی ہوئی دیکھی۔ جرس کی صدا سُنی۔ نہ پاؤں میں دَوڑنے کی طاقت۔ نہ بی بی کے چھوڑنے کی دِل کو تاب۔ سب طرح عذاب۔ نہ کوئی یار نہ غمگسار۔ نہ خدا ترس۔ نہ فریادِ رس۔ بہ حسرت و یاس قافلے کی سمت دیکھ کر یہ کہا۔ مصحفی ؎

تو ہمرہانِ قافلہ سے کہیو اے صبا
ایسے ہی گر قدم ہیں تمہارے تو ہم رہے

ناچار لڑکوں کو لے کر اسی طرف چلا۔ چند گام چل کر راہ بھول گیا۔ ایک ندی ملی۔ مگر نہ کشتی نہ ڈونگی نہ ملاّح۔ راہ سے یہ ناآشنا۔ وہاں سیّاح کا گذر نہیں۔ ایک نعرہ مارا۔ اور ہر طرف ماہیِ بے آب سا واہی تباہی پھرا۔ رہبر کامل کو پکارا۔ ساحلِ مطلب سے ہمکنار نہ ہؤا۔ مگر کچھ ڈھب ڈھبانے کا ڈھب تھا۔ ایک لڑکے کو کنارے پر بٹھا۔ چھوٹے کو کاندھے پر اٹھا دریا میں در آیا۔ نصف پانی بصد گرانی طے کیا تھا۔ کہ کنارے کا لڑکا بھیڑیا اٹھانے چلا۔ وہ چلایا۔ بادشاہ آواز سُن کر گھبرایا۔ پھر کر دیکھنے جو لگا۔ کندھے کا لڑکا پانی میں گر پڑا۔ زیادہ مضطرب جو ہؤا۔ خود

غوطے کھانے لگا۔ لیکن زندگی باقی تھی۔ بہر کیف کنارے پر پہنچا۔ دل میں سمجھا۔ بڑے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا۔ چھوٹا ڈوب مرا۔ نیرنگیٔ فلک سے عالمِ حیرت بی بی کے چھٹنے کی غیرت۔ بیٹوں کے الم سے دِل کباب۔ سلطنت کے دینے سے خستہ و خراب۔ اِسی پریشانی میں شکر کرتا پھر چلا۔ سہ پہر کو ایک شہر کے قریب پہنچا۔ در شہر پناہ پر خلقت کی کثرت دیکھی اُدھر آیا۔

اِس ملک کا یہ دستور تھا۔ کہ جب بادشاہ عازمِ اقلیم عدم ہوتا۔ ارکان سلطنت۔ روسائے شہر وہاں آکر باز اڑاتے تھے۔ وہ جس کے سر پر بیٹھ جاتا۔ اُسے بادشاہ بناتے تھے۔ چنانچہ یہ روز وہی تھا۔ باز چھوڑ چکے تھے۔ ابھی کسی کے سر پر نہ بیٹھا تھا۔ اس بادشاہِ گدا صورت کا پہنچنا تھا۔ کہ باز اِس کے سر پر آ بیٹھا۔ لوگ معمول کے موافق حاضر ہوئے۔ تخت روبرو آیا۔ ہر چند یہ تخت پر بیٹھنے سے باز رہا۔ کہا ”مجھ گم کردہ آشیاں کو سلطنت شایاں نہیں ہے۔ میں نے اِس علت سے اپنے مرزبوم شوم کو چھوڑا ہے۔ حکومت سے منہ موڑا ہے“ مگر وہ لوگ اس کے سر پر باز کا بیٹھنا عنقا سمجھ نہ باز رہے۔ جو شاہیں تھے۔ تاڑ گئے۔ پُربین پہچان گئے

کہ یہ مقررِ ہمائے اوجِ سلطنت ہے - قصّہ مختصر رگڑ جھگڑ تختِ طاؤس پر بٹھایا - نذریں دیں - توپخانے میں قُلقُل ہوئی - بڑے تزک و حشمت سے آشیانۂ سلطنت کا شانۂ دولت میں داخل کیا - تمام قلمرو و نقد و جنس - اشیائے بحری و برّی - اُن کے تحت حکومت - قبضۂ تصرف میں آیا - گز سکّے پر نام جاری ہُوا - منادی نے ندا دی - دہائی پھر گئی - کہ جو ظلم و جور کا بانی ہوگا - وہ لٹیرا گردن مارا جائے گا +

شعر سوز ؎

پل میں چاہے تو گدا کو وہ کرے تخت نشیں
کچھ اچنبھا نہیں اِس کا کہ خدا قادر ہے

کارخانۂ قدرت عجیب و غریب ہے - نہ اعتماد سلطنت - نہ قیام غربت و حسرت - مرزا رفیع ؎

عجب نادان ہیں جن کو ہے عُجب تاجِ سُلطانی
فلک بالِ ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی

یہ سلطنت تو کرنے لگا - مگر افسردہ خاطر - پژمردہ دِل - بہ سببِ شرم و حیا منفعل - حال کسی سے نہ کہتا تھا - شب و روز غمگین اور اندوہناک پڑا رہتا تھا - جب وُہ بُلبُلِ ہزار داستان یعنی فرزند شمع دودمان یاد آتے تھے - ظلِ سبحانی آہ کو لب پر لاتے تھے +

اب اِن لڑکوں کا حال سنئے۔ جس کو بھیڑیا اٹھائے لیئے جاتا تھا۔ اُدھر سے کوئی تیر انداز سیکدست آتا تھا۔ اُس نے چھڑا دیا۔ دوسرا جو غوطے کھاتا تھا۔ اُس کو ماہی گیر نے دامِ محبّت میں الجھایا۔ وہ دونو لا ولد تھے۔ اُسی شہر کے رہنے والے جہاں اِن لڑکوں کا باپ بادشاہ ہؤا تھا۔ وہ اپنے اپنے گھر میں لا بقدر مقدور لڑکوں کو پرورش کرنے لگے ❊

جل جلالہٗ۔ کیا سنگ تفرقہ فلک نے پھینکا۔ کہ ایک دُوسرے سے جُدا ہو گیا ❊

چند عرصے میں بیٹوں کی مفارقت نے بادشاہ کو بے چین کیا۔ وزیر سے فرمایا۔ کہ "دو لڑکے قوم شریف کے ہماری صحبت کے قابل لا۔ وزیر نے تمام شہر کے لڑکے طلب کئے۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ وہ دونوں بھی آئے۔ سبحان اللہ! جامع المتفرقین بھی اُسی کا نام ہے۔ بچھڑے مِلانا اُس کے روبرو کتنا کام ہے۔ وہی وزیر کو پسند آئے۔ روبرو لایا۔ بہ سبب طول زمانِ مفارقت اور تکلیف و عسرت نقشے بدل گئے تھے۔ قطع اور ہو گئی تھی۔ نہ بادشاہ نے پہچانا۔ نہ تقاضائے سِن سے لڑکوں نے باپ جانا۔ اور نہ یہ سمجھ آئی۔ کہ ہم دونوں بھائی ہیں۔ یہ بھی قدرت نمائی ہے۔ بہم ہوئے۔ مگر جُدا رہے۔ لیکن

بادشاہ بہ محبت تمام مصروف عنایت علی الدوام تھا۔ سب نے سنا ہے۔ کامل کا یہ نکتہ ہے "ہکل امر مرہون باوقا تھا" تھوڑے دن میں معتمد و مقرب ہوئے ❊

اور وہ سوداگر جَو فروش۔ گندم نما۔ دغا کا پُتلا۔ یہاں کے پہلے بادشاہ سے رسائی۔ عملے سے شناسائی رکھتا تھا۔ اِس نظر سے وہ بھی اُس عورت ناراض کو لے کر وہاں وارد ہوا۔ خبر مرگ بادشاہ سُن کر ملول ہوا۔ مطلب نہ حصول ہوا۔ لوگوں نے کہا۔ "بادشاہ تازہ وارد اُس سے زیادہ خلیق و غریب پرور ہے" بوساطت وزیر اعظم تحفہ تحائف حضور میں نذر کر شرف اندوزِ ملازمت ہوا۔ اُس کو بھی بادشاہ نے نہ پہچانا۔ نہ سوداگر نے حریف جانا۔ مگر بادشاہ اُس کو ذی اعتبار سیّاحِ دیار دیار سمجھ بیشترِ اطراف و جوانب کا مذکور سنتا ❊

ایک دن قریب شام حضور میں حاضر تھا۔ بادشاہ نے فرمایا "آج کی شب گھر نہ جانا۔ کچھ پوچھنا ہے" وہ بیٹھا۔ تو مکدر و پریشان۔ بادشاہ نے تردد کا سبب پوچھا۔ یہ بہ باعث عنایت فی الجملہ گستاخ ہو چلا تھا۔ دست بستہ عرض کی "خانہ زاد کے پاس ایک عورت ناراض ہے۔ اس کو فدوی سے اغماض

ہے۔ اُس کی نگہبانی بذات خود کرتا ہوں۔ ایسا نہ ہو۔ کہ بگل کے راز پنہاں فاش کرے۔ حمایتی تلاش کرے۔" حکم ہوا۔" یہ مقدمہ آج ہمارے ذمہ ہے۔" وہی لڑکے لبمکہ معتمد تھے۔ خاص دستہ اُن کے ہمراہ کر پاسبانی کی تاکید کی۔

لڑکے آداب بجا لاکر سوداگر کے مکان پر گئے۔ باغ میں خیمہ برپا تھا۔ اور خیمہ پر کرسی بچھاکر دونوں بیٹھے۔ لوگ گرد کھڑے ہو گئے۔ جب آدھی رات گذری ایک کو نیند آنے لگی۔ دوسرے نے کہا" سونا مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو۔ کہ کوئی فتنۂ خوابیدہ جاگے۔ خیمہ سے کوئی چونک بھاگے۔" وہ بولا" تو ایسا فسانہ کہ۔ جو نیند اُچٹنے کا بہانہ ہو۔" اُس نے کہا" خیر آج ہم اپنی سرگذشت کہتے ہیں۔ اگر غور سے سنوگے۔ تو نیند کیا۔ کئی روز بھوک پیاس پاس نہ آئے گی"۔

" اے عزیز باتمیز! میں بادشاہ یمن کا بیٹا ہوں میرا باپ للّٰہ سلطنت سائل کو دے مجھے اور ایک میرا چھوٹا بھائی کہ وہ تم سے بہت مشابہ تھا۔ اُس کو اور اپنی بی بی کو ہمراہ لے کر غریب الوطن ہوا تھا۔ راہ میں ایک سوداگر فریب سے شہزادی کو لے گیا۔ ہم دونوں بھائی ساتھ رہے۔ آگے چل کر دریا ملا۔ ناؤ بیڑا کچھ نہ تھا۔ بادشاہ مجھ کو کنارے پر بٹھا کر

چھوٹے کو کندھے پر اُٹھا پار چلا۔ مجھے بھیڑیے نے پکڑا۔ میرے چلانے سے بادشاہ بد حواس ہوا۔ بھائی دوش سے آغوشِ دریا میں کھسک پڑا۔ خود غوطے کھانے لگا۔ پھر نہیں معلوم کیا ہوا۔ مجھے تیر انداز نے دہن گرگ سے چھڑایا۔ اب فلک اس بادشاہ پاس لایا۔" وہ رو کر لپٹ گیا۔ کہا " بھائی دریا میں ہم گرے تھے۔ مچھلی والوں کے باعث ترے تھے۔" پھر دونوں بغلگیر ہو ایسے چلائے۔ کہ وہ عورت چونک پڑی۔ پردے کے پاس آکر حال پوچھنے لگی۔ انہوں نے ماجرائے گذشتہ بیان کیا۔ وہ پردہ اُلٹ لڑکوں سے لپٹ گئی۔ کہا " ہم اب تک سوداگر کی قید میں ہیں۔"

اسی دم یہ خبر بادشاہ کو پہنچی۔ سواری بھیجی۔ طلب کیا۔ اس وقت سب نے پہچانا۔ سوداگر کو قید کیا۔ صُبحدم جب جلاد سپہر بے مہر شمشیر شعاع کھینچ کر ہنگامہ پردازِ عالم ہوا۔ سوداگر کو کاروان عدم کا ہمسفر کر بارِ ہستی سے سبکدوش کیا۔

یمن میں اخبار نویسوں نے حال لکھا۔ وہاں ہڑبونگ مچا تھا۔ وہ سائل ستم شعار بدرجہ ظلم پیشہ جفا کار نکلا۔ رعیّت نالاں۔ ارکانِ سلطنت ہراساں رہتے تھے۔ ہزاروں رنج رات دن سہتے تھے۔ جب یہ خبر

وہاں پہنچی - وزیر نے زہر دے کر اُسے مارا - تلخکامی
سے نجات پائی - اور عرضداشت اپنی بادشاہ کو مع تمنائے
قدمبوسی تمام شہر کی تحریر کی - بادشاہ کو بھی محبت وطن
دل میں جوش زن ہوئی - سفر کی تیاری ہونے لگی-
القصہ یمن میں آیا - دونوں سلطنتیں قبضہ میں رہیں

۲- ہوٹل

(پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی)

رتن ناتھ نام ۔ سرشار تخلص ۔ کشمیری پنڈت ۔ لکھنؤ کے رہنے والے ۔ سنہ ۱۸۴۶ء یا سنہ ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوئے ۔ ابتداً عربی و فارسی کی تحصیل کی ۔ پھر کیننگ کالج میں داخل ہو کر انگریزی پڑھی ۔

لکھنے پڑھنے کا شوق ابتدا سے تھا ۔ آپ کے ابتدائی مضامین "مراسلہ کشمیر" اور "اودھ پنچ" نامی اخباروں میں شائع ہوئے ۔ سنہ ۱۸۷۸ء میں علم طبعی کی ایک انگریزی کتاب کا اُردو میں ترجمہ کیا ۔ یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا ۔ آپ کی شہرت یہاں تک پہنچی ۔ کہ منشی نول کشور نے آپ کو اپنے اخبار "اودھ اخبار" کا ایڈیٹر مقرر کر دیا آپ کا مایۂ ناز کارنامہ "فسانۂ آزاد" اسی اخبار میں بالاقساط شائع ہوا ۔ اور اسی اشاعت نے آپ کی شہرت

کو چار چاند لگائے ۔ آپ ۱۸۹۵ء میں حیدر آباد گئے۔ جہاں مہاراجہ سرکشن پرشاد نے آپ کی قدر افزائی کی۔ آخر حیدر آباد ہی میں ۱۹۰۲ء میں آپ راہی ملک بقا ہوئے ٭

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں :-

(۱) فسانۂ آزاد (۲) سیر کوہسار (۳) جام سرشار (۴) خدائی فوجدار (۵) طوفان بے تمیزی (۶) کامنی (۷) کرم دھم (۸) میٹھی چھری ٭

مضمون ذیل "ہوٹل" "فسانۂ آزاد" حصّہ اوّل سے لیا گیا ہے ۔ اس فسانہ کو جو شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل ہے ۔ وہ اب تک کسی اور فسانہ کو حاصل نہ ہو سکی ۔ یہ فسانہ بڑی تقطیع کی چار ضخیم جلدوں کا مالک ہے ۔ لیکن نہایت دلچسپ ۔ لکھنؤ کی مِٹی ہوئی تہذیب اور گِرِی ہوئی حالت کی سچّی تصویریں جس دلچسپ اور شگفتہ انداز میں پیش کی گئی ہیں ۔ اس نے اس فسانہ کو مقبولیت کی معراج پر پہنچا دیا ہے ٭

سرشار جادو طراز مصنّف ہیں ۔ آپ کا ذاتی اور اصلی رنگ مقفیٰ اور رنگین ہے ۔ لیکن سرور کی نسبت آپ کے یہاں اعتدال پایا جاتا ہے ۔ آپ نے مکالمہ میں کمال دکھایا ہے ۔ آپ کو ہر طبقہ کے لوگوں کی زبان پر پورا عبور حاصل ہے ۔ سوشل زندگی کی

مصوری - منظر نگاری اور مکالمہ میں آپ خاص طور پر کامیاب ہیں - اور اس کامیابی کا راز آپ کی شوخی اور زندہ دلی میں مضمر ہے - یہی وجہ ہے - کہ جب آپ اپنی جبلی شوخی اور فطری بزلہ سنجی سے الگ ہٹ کر کسی سنجیدہ مبحث پر قلم اُٹھاتے ہیں - تو عبارت میں کسی قدر خشکی - بے لطفی اور سُستی پیدا ہو جاتی ہے +

جو طلبۂ ادب وزبان اُردو لکھنو کی شُستہ و رُفتہ ٹکسالی زبان خصوصاً بیگموں - نوابوں اور اُن کے مصاحبوں کی اور ادنےٰ طبقے کے لوگوں مثلاً افیمیوں - بھٹیاریوں جواریوں کی زبان کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں - اُن کے لئے تصانیف سرشار - خصوصاً "فسانۂ آزاد" کا مطالعہ نہایت ضروری ہے - البتہ سرشار کے اسلوب بیان کی تقلید نہ ممکن ہے نہ مُفید +

میاں آزاد خانہ برباد یہاں بستر جمانے یا کسی مکان کا قبالہ لکھوانے تو آئے تھے نہیں - راہ راہ آئے - دو تین دن رہے - چلے گئے - لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہنچے تو وہ چہل پہل - وہ بھیڑ بھڑکا - وہ دھکم دھکا - کہ شانہ سے شانہ چھلتا تھا - برہمن دیوتا ڈول لئے کھٹ کھٹاتے چلے جاتے ہیں " جل ٹھنڈے "

کٹورا الگ کھنک رہا ہے۔ میاں بھشتا مشک یا مشکیزہ لئے ہوئے چہل قدمی کر رہے ہیں۔ ایک سمت ساقی دوسیرا خمیرہ بھر کر گڑ گڑی لئے گڑ گڑا رہا ہے۔ وہ مشکبو کہ دماغ طبلۂ عطار ہو جائے چبوترے کے سامنے کمہار برتن چن کر بیٹھا بیچ رہا ہے۔ مٹی کے کھلونوں پر وہ جوبن۔ کہ باہر والے بصد شوق خرید لے جاتے ہیں۔ خریداروں پر خریدار ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پیسہ پھینکا اور حقہ لیا۔ اُدھر میاں بھشتا نے تازہ کر دیا۔ اور ساقی نے چلم تیار کی۔ دھواں دھار اُڑانے لگے۔ کھٹک نے آواز لگائی "گلابی میوہ شہتوت۔ امرس ہے آم کے رسوں کا۔ قلمی آم کے رسوں کا" فقیر محمد خاں کے باغ کا سفیدہ۔ بنارس کا لنگڑا۔ چار باغ کا بمبئی۔ رنگترے۔ سنگترے۔ کو لے۔ اناناس۔ نارنگیاں شریفہ۔ امرود۔ سیب۔ جو چاہیے خرید لیجئے۔ ایک طرف حلوائی کی دکان۔ مٹھائی کے خوان۔ برفی کے تھال۔ ورق نقرہ لگے ہوئے۔ پستے کی ہوائیاں! لوہے کے چراغ لٹکے ہوئے ہیں۔ دکان جھک جھک کر رہی ہے۔ اتنے میں آواز آئی "بسکٹ لو بسکٹ" "کباب کلیجے" اِدھر اُدھر گھومے۔ تو ٹوپی والا سامنے آن موجود ہوا۔ دو پلی ٹوپیاں۔ شربتی جامدانی چکن۔

مری کے کام کی گرگابی ۔ مندیل گول ٹوپی ۔ نئے نئے فیشن ۔ نرالی اور انوکھی وضع کی ٹوپیاں جھڑا جھڑ دکھا رہا ہے ۔ اور گاہک پر گاہک بصد شوق دام چکا رہا ہے ۔ دس پانچ ہاتھوں ہاتھ بک گئیں ۔ دُور دُور تک مسافر بستر جمائے ۔ کوئی زین پوش ۔ کوئی دری بچھائے بیٹھا ریل کی راہ تک رہا ہے ۔ کوئی گنوار اکڑوں بیٹھا اناپ شناپ بک رہا ہے ؎

میاں آزاد اپنے دل میں سوچے ۔ کہ اللہ اللہ ریل کا اسٹیشن کیا خاصہ میلہ ہے ۔ کچھ ٹھکانہ ہے یہ بھیڑ ۔ یہ دھوم ۔ یہ رونق ۔ بھئی واہ رے لکھنؤ! واللہ ایسا اسٹیشن بھی نہیں دیکھا ؎

میاں آزاد ٹہلتے ہوئے اسٹیشن کے اندر گئے ۔ ہوٹل دیکھا ۔ تو باچھیں کھل گئیں ۔ اہو ہو ہو! کیا صاف و شفاف ہے ۔ ہر شے قرینے سے چنی ہوئی در و دیوار سے صفائی برس رہی ہے ۔ ہر سمت نور کا عالم ہے ۔ اس سرے سے اُس سرے تک میز اور اس کے گردا گرد کرسیاں ۔ گلاس چنے ہوئے لمپ اور کنول ہر طرف روشن ہیں ۔ میاں آزاد بھی کرسی پر جا کر ڈٹ گئے ؎

" کھانا لاؤ ۔ مگر شراب کا لگاؤ نہ ہو ۔ اور لحم خوک پاس نہ آنے پائے " ؎

ایک چپراسی صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے چوبداروں کی سی پگڑی باندھے ہوئے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"حضور! شراب تو نہ ہوگی۔ مگر اور کیا آپ نے حکم دیا؟"

میاں آزاد نے کہا "لحم خوک (آہستہ سے) یعنی سؤر کا گوشت نہ ہو"۔

چپراسی۔ "نا حضور! کیا مجال"۔

یہ کہہ کر چپراسی نہایت ہی قیمتی۔بیش بہا پلیٹوں میں طرح طرح کا انگریزی کھانا لایا۔ میاں آزاد نے چھری کانٹے سے خوب مزے سے چکھا۔ اور سوڈا واٹر اور لیمونیڈ پیا۔ اور باہر پہنچے۔ تو کیا دیکھتے ہیں۔ میاں خوجی بھی بستر جمائے ہوئے پراٹھے اور کباب کلیجے چکھ رہے ہیں۔

آزاد۔ واہ استاد! تم تو خوب مزے سے کباب اڑا رہے ہو۔

خوجی۔ پھر کوئی شراب اڑائے۔ کوئی کباب کھائے۔

آزاد۔ ایں۔ شراب! لاحول ولا قوۃ۔ اے میاں شراب کس نے منہ سے لگائی۔ یہ کس کی شامت آئی۔ یہاں دختِ رز سے واسطہ ہی

نہیں رکھتے ۔ بنت العنب کے دلدادہ عاشق کوئی اور ہی ہوں گے ۔ ع

کردم ز شراب ناب توبہ

خوجی ۔ اور آگے تو کہئے ۔ ع

کردم ز شراب ناب توبہ اور آگے

و ز کردۂ ناصواب توبہ

آزاد ۔ قسم قرآن کی ! کس مردک نے شراب کا ایک قطرہ بھی چھوا ہو ۔ شراب پی ہو ۔ تو سؤر ہی کا گوشت کھایا ہو ✦

خوجی ۔ (مسکرا کر) لتسلیم ۔ ایک نہ شد دو شد ۔ آپ نے سؤر کا گوشت بھلا کب چھوڑا ہوگا ۔ واللہ مانتا ہوں ۔ کہنے لگے ۔ شراب پی ہو تو سؤر کا گوشت کھایا ہو ۔ معقول ! یہ تو آپ تب کہیں ۔ جب اس کو حرام یا مکروہ بھی سمجھیں ۔ آپ دونوں کو حلال اور دونوں کو مستحسن سمجھتے ہیں ۔ یار ! آج تو تم نے غضب ہی کر دیا ✦

آزاد ۔ ارے بھئی ! آخر کیا کیا ۔ کچھ کہو گے بھی ۔ یا ملاحی ہی سنائے جاؤ گے ۔ سبحان اللہ ۔ قسم لو جو ہم نے شراب کو ہاتھ بھی لگایا ہو ۔ یا سؤر کے گوشت کی صورت بھی دیکھی ہو ✦

خوجی ۔ ہاں ! یہ آپ نے خوب کہی ۔ کہ سؤر کے

گوشت کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ مگر یار مزہ تو خوب چکھا ہوگا۔ اور شراب کو ہاتھ آپ کیوں لگاتے۔ گلے لگائی ہوگی گلے۔ اور آپ کی قسم کا کس مردود کو اعتبار ہے۔ قسم کو تو آپ مانتے ہی نہیں۔ مجھے آج تک یہ ہی نہیں معلوم ہوا۔ کہ آپ کا دین ایمان کیا ہے۔ تمہارا تو بابا آدم ہی نرالا ہے۔ خیر جی! اپنی اپنی سب بھگت لیں گے ہم کو اس بھگیڑے سے کیا واسطہ ✦

آزاد۔ نہ ہاری مانتے ہو نہ جیتی ✦

خوجی۔ مانیں کیا خاک۔ مانیں کیا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کہ چھری کانٹا کھٹ کھٹ چل رہا ہے ✦

آزاد۔ تو بھائی چھری کانٹے سے کوئی شراب پیتا ہے ✦

خوجی۔ ہم کیا جانیں۔ ہماری جانے جوتی۔ کہ شراب کیوں کر پیتے ہیں۔ یہ کسی اپنے ایسے میگسار بادہ خوار سے تحقیقات کیجئے۔ افسوس! واللہ بس تم گئے گذرے ہائے ستم۔ خیر مضیٰ مامضیٰ ✦

آزاد۔ آپ ایک کام کیجئے۔ ہوٹل میں جا کر ✦

خوجی۔ اے لاحول۔ اے لاحول۔ خدا ایسی جگہ کسی میخ اور پکے مسلمان کو نہ لے جائے۔ توبہ توبہ!

(اپنے کان پکڑ کر) خداوندا بچائیو۔ گنہگار بندہ ہوں۔ ارے توبہ۔ ہوٹل میں اور ہم جائیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ بس آپ ہی کو مُبارک رہے قبلہ۔ بندہ در گذرا ٭

میاں آزاد ٹہلنے لگے۔ اور خوجی نے کباب اور کلچوں پر خوب ہنتھے لگائے۔ جب صفاچٹ کر چکے۔ تو حلوائی کی دکان سے برفی لائے۔ اور افیون کے نشہ میں ڈونگارنے لگے۔ تو اتنے میں ایک صاحب باریش دراز یک مُشت و پنجاہ اُنگشت نے میاں آزاد کو مخاطب کرکے کہا۔ کہ "کیوں حضرت! آپ کا اسم مبارک"؟ یہ بولے "میاں آزاد" وہ مُسکرائے اور کہا۔ کہ "ہاں واللہ۔ آپ کے قد و قامت اور وضع قطع پر یہ نام موزوں ہے۔ آزادی اور آزادہ روی صورت سے برستی ہے۔ ملّت کیا ہے"؟

آزاد نے کہا ؎

از مذہبم مپرس نہ مومن نہ کافرم
من رسم ایں دیار ندانم مُسافرم

حضرت بندہ مسلمان ہے۔اور مُسلم ایمان ہے۔ پابند شرع۔ آپ کا اِسم شریف جناب مولوی صاحب؟

مولوی صاحِب۔ اسم شریف تو چھپّر پہ رکھئے۔ اِس وقت مجھے افسوس کرنے دیجئے ٭

آزاد - بسم اللہ! آپ افسوس کر لیجئے - بلکہ رو دیجئے - مگر سنئے تو سہی - محرم الحرام کے دن قریب ہیں۔ خوب پیٹ بھر کر رو لیجئے گا - ایسی بیتابی کیا ہے؟

مولوی صاحب - آپ مسلمان اور پابند شرع بتاتے ہیں اپنے آپ کو - اور ہوٹل میں جا کر شراب خانہ خراب استعمال میں لاتے ہیں - عیاذاً باللہ - مرد خدا آخر انجام کی بھی فکر ہے - یا سگ دُنیا ہی بنے رہو گے +

آزاد - قبلہ بس اب کیا کہوں - بجز سکوت کے اور کوئی کلمہ زبان پر نہیں آنے پاتا - لاحول ولا قوۃ +

مولوی صاحب - بے ادبی معاف - لاحول تو آپ اپنے ہی اُوپر پڑھتے ہیں - آپ سے حرکت شیطانی ہی ایسی سرزد ہوئی - مگر بحمد اللہ کہ آپ کا نفس لوامہ آپ کو ملامت تو کرتا ہے +

آزاد - مولانا خدا کی قسم - میں نے ہوٹل میں صرف کھانا کھایا - مگر وہ اغذیہ جو شرع کی رُو سے حرام نہیں - پس نظرِ انصاف سے دیکھئے - تو اِس میں قباحت ہی کیا ہے - آخر روم میں بھی تو صغیر و کبیر اور بڑے بڑے علماء تحریر عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں - پھر یہاں ہندوستان کے مسلمان اِس کو داخل گناہ کیوں سمجھنے لگے - مَیں نے کیا کُفر کیا - کہ مردُود اور مطرود اور زندیق اور ملحد اور مرتد

بنایا جاتا ہوں ؛

مولوی صاحب۔ مجھ سے سُنیئے میں عرض کروں نہ۔ ہوٹل میں جانا اہل اسلام کے لئے مستحسن نہیں۔ جو کھانا آپ نے ہوٹل میں چکھا ہے۔ اگر باہر منگوا کر اور فرش بچھوا کر چکھتے۔ تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ گو یہ بھی معیوب تھا۔ مگر اس درجہ نہیں۔ پھر آپ لاکھ قسمیں کھایئے۔ قرآن اُٹھایئے۔ یقین کس ملعون کو آئے گا۔ کہ آپ نے شراب نہیں پی یا سُؤر کا گوشت نہیں کھایا۔ کاجل کی کوٹھڑی میں جو جائے گا۔ وہ مُنہ کالا کرکے آئے گا۔ کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے ہی ہوتے ہیں۔ روم کی نہ کہیئے۔ شاہ ایران مزے سے شراب ناب اور بیش بہا برانڈی نہیں اُڑاتے؟ پھر اِس سے بادہ خواری کا جواز نہیں ثابت ہوتا۔ رومی لاکھ عیسائیوں کے ساتھ لقمے لگائیں۔ اور بے تکلفی سے کھائیں۔ ہم کو تو ایسا نہ چاہیئے۔ ہمارے رسوم کے خلاف ہے۔ آپ کو روم میں رہنا ہے یا ہندوستان میں۔ روم کی بات روم کے ساتھ۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خیالات کا تذکرہ ہے یا روم اور رومیوں کی عادات کا۔ آخر باہر بھی تو کباب بکتے۔ شیرمال پراٹھے۔ باقر خانی۔ روغنی روٹی۔ بسکٹ سب ہی

کچھ بکتا ہے۔ پھر وہاں کھانے میں کون بہتری تھی۔ مُفت میں اپنے آپ کو بکو بنانا۔ اور ہنسوانا کونسی دانائی ہے ٭

آزاد۔ حضرت وہاں اوّل تو کھانا عمدہ اور لذیذ۔ دوسرے مقام صاف و شفاف۔ جس لطف سے ہم نے وہاں کھانا کھایا۔ وہ یہاں کُجا۔ قلی کھڑا پنکھا جھل رہا ہے۔ صاف ستھرا پنکھا جھل رہا ہے۔ پلیٹیں صاف۔ میز شفاف۔ چار چار چپراسی خدمت کے لیئے کھڑے ہیں۔ یہاں یہ باتیں کُجا۔ لاحول ولا قوۃ ٭

مولوی صاحب۔ کھانا عمدہ تو آپ سمجھتے ہونگے۔ باقی رہا پنکھا۔ ایک پیسہ دے دیجئے۔ گھنٹہ بھر پنکھا جھلوا لیجئے۔ اور صفائی کو مسافرت سے کیا کام۔ سوائے ازیں یہاں بھی کوئی غلیظ شے نہیں ہے۔ یوں وحشت کی بات ہی اور ہے۔ خیر حضرت آپ جانیں آپ کا کام جانے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پند پیرِ دانا را

مانو یا نہ مانو۔ اس سے یہاں غرض نہیں۔ ماننا نہ ماننا آپ کے ہاتھ ہے۔ ہم نے کہ دیا ٭

میاں آزاد نے اپنے دل میں سوچا۔ کہ آج سے ایسی حماقت نہ کریں گے۔ کہ ڈنکے کی چوٹ ہوٹل

یں جائیں - اور مفت میں اپنے آپ کو ہنسوائیں۔
یوں تو ہمیں اختیار ہے - کہ چاہے ہوٹل میں جائیں۔
یا جو کھائیں - مگر خاموشی کے ساتھ - یہ نہیں - کہ
اسٹیشن بھر میں گھومتے پھریں - کہ

ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں

خوجی - کیوں بھلا خیر ایک ہمیں کو آپ الّو بناتے
تھے - اب تو ایک مولوی صاحب نے آپ کو
قائل کر دیا - ہات ترے کی - اور ہوٹل میں کھاؤ۔

۳۔ تعلیم

(سر سیّد احمد خاں)

سر سیّد احمد ۱۸۱۷ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۷-۱۸ سال کی عمر سے مضمون نگاری شروع کی۔ لیکن ۱۸۵۷ء تک پُرانی روش پر جس کی بنا تصنع اور آورد پر ہوتی ہے۔ لکھتے رہے۔ اِس کے بعد نئی طرز ایجاد کی +

ملازمت کے سلسلے میں سر سیّد احمد کو متعدد شہروں اور قصبوں میں رہنے کا اِتفاق ہوا۔ آپ مسلمانوں کی انگریزی تعلیم کے حق میں تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک انگریزی سکول مُراد آباد میں اور دوسرا غازی پور میں کھولا۔ اور غازی پور ہی میں ایک سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ جس کا مقصد مسلمانوں میں مغربی علوم و فنون سے بیداری پیدا کرنا تھا +

۱۸۶۴ء میں سر سید غازی پور سے تبدیل ہو کر علیگڈھ آئے۔ اور سائنٹیفک سوسائٹی کو بھی یہاں منتقل کر لیا۔ ۱۸۶۶ء میں آپ نے اسی سوسائٹی سے ایک اخبار نکالا۔ جو "علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کے نام سے آخر دم تک جاری رہا۔ اس اخبار میں سماجی۔ اخلاقی علمی اور سیاسی مضامین چھپتے تھے۔ اور یہ مضامین زیادہ تر سر سید ہی کے ہوتے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں آپ نے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ جو چھ برس تک برابر نکلتا رہا۔

۱۸۷۶ء میں سر سید نے ملازمت سے کنارہ کش ہو کر علی گڈھ میں مستقل قیام کیا۔ اور ۱۸۷۷ء میں وہاں ایک کالج قائم کیا۔ جو ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ اور آج علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔

سر سیّد کو آخر دم تک قومی خدمات کی دھن اور کالج کی بہبودی کا خیال رہا۔ آخر ۱۸۹۸ء میں اس محسن قوم نے جہانِ فانی سے کوچ کیا۔

سر سیّد نے علاوہ متعدد مذہبی رسالوں کے چند کتابیں مفید اور عام دلچسپی کی تصنیف کیں۔ منجملہ ان کے "آثار الصنادید" جس میں دہلی کی مشہور عمارات اور آثار قدیمہ کے بارے میں مفید معلومات درج کی

ہیں - نہایت اہم تصنیف ہے - علاوہ ازیں ایک اور کتاب "سرکشی بجنور" ہے - جس میں واقعات غدر جو ضلع بجنور میں گذرے - تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں - لیکن سرسیّد کا سب سے بڑا کارنامہ آپ کے وہ مضامین ہیں - جو تہذیب الاخلاق میں چھپتے رہے - اور اب کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں - اِن مضامین میں سرسیّد کی عبارت تصنع اور تکلّف سے قطعی پاک ہے - الفاظ سیدھے سادے - مگر زور دار مشکل سے مشکل مضامین اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو نہایت سادگی اور صفائی سے اس طرح بیان کرتے ہیں - کہ مطالب فوراً ذہن نشین ہو جاتے ہیں +

سرسیّد پہلے اُردو مصنّف ہیں - جنھوں نے علمی - مذہبی اور فلسفیانہ مضامین لکھے - اور اُن کے لئے پُر زور مگر سلیس نثر عاری اِختیار کی - سرسیّد کے زمانہ ہی میں یہ رنگ مقبول ہو چکا تھا لوگوں نے اسی رنگ کو کسی قدر ادل بدل کر اِختیار کیا - اور آج تک یہی رنگ جاری ہے - لہٰذا اگر سرسیّد کو زمانہ حال کی طرز انشا کا باوا آدم کہا جائے - تو مبالغہ نہ ہوگا +

تعلیم سے ہماری مُراد عرف عام کے موافق لِکھنا

پڑھنا سیکھنے سے ہے۔ ہر زمانہ میں لاکھوں کروڑوں آدمی مختلف مقاصد سے لکھنا پڑھنا سیکھتے رہتے ہیں ٭

عام مقصد جس کے سبب سے تعلیم پر توجہ ہوتی ہے۔ خواہ تعلیم پانے والے خود اس پر متوجہ ہوں۔ یا اطفال کے مربیوں نے اطفال کی تعلیم پر توجہ کی ہو۔ یہ ہے۔ کہ ان کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہوتی ہے۔ کہ ایک جاہل کندۂ ناتراش سے لکھا پڑھا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوئی ہو؛ زندگی کے کاروبار میں اُس کے لئے مفید اور کارآمد ہوتی ہے ٭

اُن تعلیم پانے والوں میں لاکھوں آدمی ایسے ہوتے ہیں۔ کہ ادنےٰ درجۂ تعلیم تک پہنچ کر اور کچھ متوسط درجۂ تعلیم تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔ اور چند ایسے ہوتے ہیں؛ کہ متوسط درجہ کی تعلیم سے آگے پڑھتے ہیں۔ اور اپنے مذاق کے موافق علم کی شاخوں میں سے کسی شاخ کی تکمیل پر مائل ہوتے ہیں۔ کوئی شاعر بنا چاہتا ہے۔ کوئی۔ ادیب۔ کوئی فلسفہ میں ترقی کرتا ہے۔ اور کوئی ریاضیات میں۔ اور کوئی دینیات

میں وعلٰے ہذا القیاس۔ مگر ہر ایک کے ساتھ حصول معاش کا خیال لگا رہتا ہے۔ اور جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے۔ اس کو ذریعہ حصول معاش ضرور سمجھتا ہے +

تعلیم بغیر اس کے کہ اُس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی زبان اختیار کی جاوے۔ غیر ممکن ہے۔ جس زمانہ میں جس زبان کا عروج ہوتا ہے۔ وہی زبان اُس کے لئے اِختیار کی جاتی ہے۔ یہ ایک کلیّہ قاعدہ ہے۔ کہ جس ملک میں جو زبان حکومت کرتی ہے۔ اسی زبان کا عروج ہوتا ہے۔ خلفائے بنی اُمیّہ و بنی عبّاس کے زمانہ میں عربی زبان کا عروج تھا۔ ہر شخص اُسی زبان میں علوم کو سیکھنا چاہتا تھا۔ ہندوؤں کے زمانے میں ہندوستان میں سنسکرت زبان کا عروج تھا۔ اُسی کو لوگ اختیار کرتے تھے۔ جب مسلمانوں کی عملداری ہندوستان میں ہوئی۔ تو فارسی زبان کا عروج ہوا۔ اور سب نے فارسی زبان میں تعلیم پانا اختیار کیا۔ اب ہندوستان میں انگریزی حکومت ہے۔ جس کی زبان انگریزی ہے۔ اور اسی زبان کو عروج ہے اِس لئے ہر شخص اِسی زبان کے اختیار کرنے پر مائل ہے۔ ہاں مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں بہت کچھ کوتاہی کی۔ اِس کے

کچھ ہی سبب ہوں - مگر اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا - کہ وہ اپنی غلطی سے انگریزی زبان پڑھنے کو مخالف مذہب اِسلام سمجھتے تھے - مگر جب سے یہ خیال کم ہو گیا - یا دینوی ضرورت نے انہیں مجبور کیا - اسی وقت سے مسلمانوں نے بھی انگریزی زبان میں تعلیم اختیار کرنی شروع کر دی ہے - مگر بہت سے مسلمان مذہب کو دُنیوی ضرورت سے مقدم سمجھتے ہیں - اور اِس لئے کہا جا سکتا ہے - کہ اُن میں یہ خیال کہ انگریزی پڑھنی مذہب اسلام کے برخلاف ہے - کم ہو گیا ہے +

اکثر حکام کا اور نیز بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے - کہ لوگ صرف سرکاری نوکری حاصل کرنے کو انگریزی پڑھتے ہیں - مگر غور کرنے کی بات ہے - کہ ہر سال ہندوستان کی یونیورسٹیوں سے سینکڑوں بی - اے اور ایم - اے ڈگری پاتے ہیں - اور اُن کو یقین کامل ہوتا ہے - کہ گورنمنٹ کے پاس اِس قدر نوکریاں نہیں ہیں - کہ وہ اِس جم غفیر بی - اے اور ایم - اے ڈگری یافتوں کو دے سکے - پس یقینی ڈگری یافتہ طالب علموں کو اِس کا یقین ہے - کہ سب کو سرکاری نوکری نہیں مِل سکتی - باوصف اس یقین کے جو وہ انگریزی پڑھنے پہ مشغول

ہیں - تو ضرور ہے - کہ سوائے ملازمت سرکاری
کے اور کسی ذریعہ سے بھی ان کو معاش حاصل
کرنے کا خیال ہے - یا اس بات کا یقین ہے - کہ
انگریزی پڑھا ہؤا بن انگریزی پڑھے ہوئے سے
دُنیوی کاروبار کے لیۓ زیادہ مفید اور کارآمد ہے
بہر حال یہ بات غلط ہے - کہ ہر ایک بی - اے
اور ایم - اے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے
لیۓ پڑھتا ہے - اور نہ ملنے کے سبب سرکار سے
ناراض ہوتا ہے - کیونکہ اس کو پہلے سے یقین ہے -
کہ سرکار سب کو نوکریاں نہیں دے سکتی - ہاں
جب موقع ہوتا ہے - تو ہر ایک سرکاری ملازمت
ملنے کی کوشش کرتا ہے - جو اُس کو ضرور کرنی
چاہیۓ *

اِس زمانہ کی تعلیم میں جو بذریعہ انگریزی زبان
کے ہوتی ہے - اور اگلے زمانے کی تعلیم میں جو
بذریعہ عربی ہوتی تھی - یہ فرق ہے - کہ اگلے زمانہ
میں تعلیم کا سامان ایسا موجود اور مہیا تھا - کہ ہر
شخص جو علم کی کسی شاخ میں یا شاخوں میں اس
زمانے کے موافق اعلےٰ درجہ کی تعلیم پانا اور اُس فن
کا ماسٹر ہونا چاہے - تو ہو سکتا تھا - اور سوسائٹی جو
اُس زمانے میں موجود تھی - اُس تعلیم کی مدد کرتی تھی

اور اُس پر عمدہ اخلاقی اثر ڈال کر اُس کو اِس سوسائٹی کے لائق کر لیتی تھی۔ اگلے زمانہ کی سوسائٹی بلحاظ اخلاق اور حسنِ معاشرت کے ایسی عمدہ تھی۔ کہ اس میں کوئی نقص اس زمانے میں بھی نہیں نکالا جا سکتا۔ مگر افسوس ہے۔ کہ زمانہ کے انقلاب کے ساتھ وہ قائم نہ رہی *

اِس زمانے کی تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے۔ کہ جو شخص کسی علم کی کسی شاخ میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہے۔ تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر اس فن کا ماسٹر ہو سکے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم دینے والی وہ یونیورسٹیاں ہیں۔ جو ہندوستان میں موجود ہیں۔ وہ بلا شبہ بی۔ اسے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ مگر اُس تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کہنا ہمارے نزدیک محض نا واجب ہے۔ بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجے کی تعلیم ہے۔ اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے *

بالفعل جو باتباع احکام یونیورسٹیوں کے اس کے ماتحت کالجوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ زیادہ تر کتابی اور دماغی تعلیم سے متعلق ہے۔ اِس قسم

کی تعلیم کا نتیجہ ضرور وہی ہونا چاہیئے - جو مسٹر کرول
نے اپنے لیکچر میں بیان کیا ہے - اور جس کو اودھ
اخبار نے اُردو زبان میں لکھا ہے - انہوں نے
فرمایا - کہ " تعلیم کا منشاء یہ نہیں ہے - کہ چند
آدمیوں کی دولت بڑھ جائے - یا آنکہ غرباء کے
بمقابلہ باقی ماندہ اشخاص کی زیادہ رعایت کی جائے -
اور نہ تعلیم کا منشاء یہ ہے - کہ اس کے ذریعے
سے لوگ صرف اپنی باہمی محافظت کریں - یا سوداگری
اور تجارت ہی کو ترقی دیں - بلکہ تعلیم کی خاص
غایت اور اصل منشاء یہ ہے - کہ لوگ نیک محض
اور عمدہ قسم کے باشندے ہو جاویں - اور وہ
خاموشی حاصل کریں - جو زندگی کے بلے داغ رہنے
سے حاصل ہو سکتی ہے - اور لوگوں کے سوشیل اور
اخلاقی خصایل کی تکمیل کریں - اور اُن بھاری اور
عمدہ کاموں کا حوصلہ دلائیں - جن سے مُلک کی
عزت اور زینت ہوتی ہے "

سر ولیم میکورتھ ینگ نے جو ڈگری یافتہ طالب
علموں کو مخاطب کر کے فرمایا - اس کا حاصل بھی
وہی ہے - جو مسٹر کرول نے اپنے لیکچر میں کہا
تھا - سر ولیم میکورتھ ینگ نے ڈگری یافتہ طالب
علموں کو مخاطب کر کے فرمایا - کہ " اُن کی ڈگریاں

اس بات کے لئے ہیں۔ کہ وہ اپنے یومیہ معاملات اور گفتگو میں معزز برتاؤ اختیار کریں۔ اخلاق اور عمدہ تعلیم کی ترقی میں مدد دیں۔ سوشیل انتظام اور اپنے ہم جنسوں کی بہبودی کے قائم رکھنے میں کوشاں رہیں۔ المختصر ایک بھاری سلطنت کے بر آوردہ شہریوں کے فرائض ادا کرتے رہیں"۔

مگر ہماری رائے میں اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کو تعلیم دیتی ہے۔ ہندوستان میں جو قدیم سوسائٹی علماء اور نیک خدا پرست۔ رحم دل۔ نیک خصلت لوگوں سے مرکب تھی۔ وہ مدت ہوئی۔ کہ مردہ ہو گئی ہے۔ اور نئی سوسائٹی جو زمانہ حال کے موافق ہو۔ اب تک قائم نہیں ہوئی۔ یا مکمل نہیں ہوئی۔ اس لئے اس کے وہ نتائج جن کا ذکر مسٹر کرول نے اپنے لیکچر میں کیا۔ یا سر ولیم میکورتھ ینگ نے ڈگری یافتہ طالب علموں سے خواہش کی۔ حاصل نہیں ہوتی۔

ہم اس بات کو جیسا کہ اودھ اخبار نے لکھا ہے۔ نہایت مفید اور ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ سکول ماسٹروں کو چاہئے۔ کہ اپنے شاگردوں کے نقش ذہن کرتے رہیں۔ کہ وہ اعلےٰ درجہ کا چلن اور شریفانہ

الوالعزمیاں اختیار کریں ۔ اور اسی طرح ہمارے کالجوں کے پروفیسروں کو بھی منجملہ ایسے لوگوں کے ہونا چاہیئے ۔ جن میں خیالات عالیہ پائے جاتے ہوں ۔" مگر ہماری رائے میں جب تک کہ خود اسی قوم کے چند لوگ اُس قوم کی سوسائٹی کے مہذب کرنے پر آمادہ نہ ہوں ۔ اور دلی سعی و کوشش نہ کریں ۔ سوسائٹی کی حالت درست نہیں ہو سکتی ۔ اور یہی سبب ہے ۔ کہ باوجودیکہ کئی قرن گورنمنٹ کو ہندوستانیوں کو تعلیم دیتے ہوئے گذرے ۔ مگر اُن کی سوسائٹی کی حالت اب تک درست نہیں ہوئی ۔ نہایت مشکل یہ ہے ۔ کہ دنیا میں کسی قوم کی سوسائٹی اور شوشل حالت ایسی نہیں ہے ۔ کہ جس میں ایسے امور بھی شامل نہ ہوں ۔ جن کی بنا غلط یا صحیح طور پر مذہبی امور پر مبنی ہونی نہ کہی جاتی ہو ۔ پس اگر وہ امور ترقی سوسائٹی کے مانع ہیں ۔ اور غلطی سے اُن کی بنا مذہبی امور پر کہی جاتی ہے تو جب تک اُسی قوم کا کوئی شخص اُس غلطی کو ظاہر نہ کرے ۔ اور اُس مانع کے رفع کرنے میں کوشش نہ کرے ۔ تو وہ رافع نہیں ہو سکتی ۔ غیر قوم کے شخص کا اس امر پر متنبہ کرنا گو وہ کیسا ہی سچ کہتا ہو ۔ مخالف اثر پیدا کرتا ہے ۔ اور خیال

ہوتا ہے۔ کہ وہ شخص بہ سبب اختلاف قومی یا مخالفت مذہب کے ایسا کہتا ہے۔ اگرچہ ہم قوم اور ہم مذہب والے پر بھی ہزاروں شخص طرح طرح کے اتہام لگاتے ہیں۔ اور اس کی بات کی سماعت نہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور گورنمنٹ تو ایسی کوئی بات جس سے مذہب میں مداخلت کرنے کا شبہ بھی ہو۔ اختیار نہیں کر سکتی۔ جس سے ہندوستانیوں میں سوسائٹی کی حالت اچھی ہو۔ اور عمدہ سوسائٹی ان کی بن جاوے۔

وہ دماغی تعلیم جس کا ہم نے ابھی اوپر ذکر کیا۔ کچھ شبہ نہیں ہے۔ کہ انسان کو انسان اور اس کی عقلی اور دماغی قوتوں کے کامل اور اس کے اخلاق کو عمدہ بنانے میں بہت کچھ مدد کرتی ہے۔ مگر جب مسئلہ حصول معاش پر نظر کی جاتی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ یقینی امر ہے کہ محض علمی پیشوں میں حصول معاش کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں ہے اور اس لئے ان کا اور نیز ہمارے حکام کا اس طرف خیال جاتا ہے کہ حرفت اور فن کی تعلیم کو جسے سینئر اور ٹیکنیکل ایجوکیشن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ زیادہ وسعت دی جاوے۔

ٹیکنیکل ایجوکیشن کے معنی تو ہم آج تک نہیں سمجھے۔ کہ اس سے کیا مراد ہے۔ اگر اس کی مراد حرفوں کی تعلیم سے ہے۔ جیسے لوہاری۔ نجاری۔

نور بافی وغیرہ وغیرہ۔ تو اِس کی ضرورت تو ہم ہندوستان میں بہت کم پاتے ہیں۔ کیونکہ اس قسم کے تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہندوستان میں نہیں ہے۔ اگر یورپ کو یا اور کسی ملک کو اِس باب میں کچھ تفوق ہے۔ تو وہ صرف اِس وجہ سے ہے۔ کہ جو کام ہندوستان میں ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ وہ اُن ملکوں میں کلوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ مگر کلیں قائم کرنے والی ایک جُدا جماعت ہے۔ ہندوستان میں اگرچہ کہیں کہیں ایسی جماعتیں قائم ہوئی ہیں۔ مگر ہندوستان میں عام طور پر ایسی جماعتوں کا قائم ہونا ظاہرہ بہت دُور اور بعض وجوہ سے اگر ناممکن نہیں۔ تو مشکل تو ضرور معلوم ہوتا ہے ؀

سینٹر بلا شبہ نہایت عمدہ شے ہے۔ اور سینٹر کا جاننے والا آج کل کے زمانے میں قریب قریب ہر حرفت پر پُورا پُورا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور معاش حاصل کرنے کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ اُس کے پاس ہوتا ہے۔ جیسا کہ یورپ کے ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔ مگر یورپ کے ملکوں کا قیاس ہندوستان پر نہیں ہو سکتا۔ یورپ میں ہر قسم کے متعدد کارخانے موجود ہیں۔ اور اِس لئے

یورپ کی یونیورسٹیوں میں سینز کی تعلیم دینا فائدہ سے خالی نہیں۔ کیونکہ ہر قسم کے سینز جاننے والے کے لیئے ہر قسم کے کارخانے موجود ہیں۔ جن میں وہ جا سکتا ہے۔ اور اپنی معاش پیدا کر سکتا ہے۔ مگر ہندوستان میں اِس قسم کے کارخانے نہیں ہیں۔ اور نہ ابھی اُن کے ہونے کی توقع ہے۔ پس سینز جاننے والا بجز اس کے کہ سینز کا عالم ہو کر اپنے گھر میں بیٹھا رہے۔ اور کوئی ذریعہ معاش کا حاصل نہیں کر سکتا۔ گورنمنٹ ڈاکٹری۔ انجنیری۔ نقشہ نویسی وغیرہ کی جو ٹیکنیکل ایجوکیشن یا سینز میں داخل ہیں۔ بقدر ضرورت اس ملک کے تعلیم دیتی ہے اور اس ذریعہ سے وہ لوگ بھی معاش پیدا کرتے ہیں۔ مگر اِس سے زیادہ تعلیم کی نہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں گنجائش ہے۔ اور نہ وہ اس تعلیم سے کچھ معاش پیدا کر سکتے ہیں۔

بڑی ضرورت ہندوستان میں اعلیٰ درجے کی دماغی تعلیم کی اور اخلاقی اور سوشیل حالت کی دُرستی کی ہے۔ جو ابھی تک نہیں ہوئی۔ یا پُورے طور پر نہیں ہوئی۔ اس کے بعد باقی امور لحاظ کے قابل ہیں۔ پس ہم کو مناسب نہیں ہے۔ کہ ہم دفعتہً سب امور کا ہونا چاہیں۔ بلکہ جو کام

ہم کو پہلے کرنا ہے ۔ اُس کو مقدم سمجھیں ۔ اور اس کے بعد جو کام کرنے ہیں ۔ وہ کریں ✤

۴۔ خطوط

(۱۔ مولانا غلام امام شہید)

مولانا غُلام امام نام۔ شہید تخلص۔ قصبہ امیٹھی۔ ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ شاعری میں مصحفی کے شاگرد تھے۔ نثر میں آپ کا رنگ مقفیٰ اور مسجع ہے۔ لفظ لفظ میں تصنع اور بات بات میں آورد "مجموعہ میلاد شریف" "انشائے بہار بے خزاں" آپ کی تصنیفات ہیں +

رقعۂ تہنیت و تعزیت آمیز۔

مجموعۂ انشائے شیریں زبانی۔ دیباچۂ کتاب سُخنِ مَعانی۔ زاد حشمتہٗ۔ قلم بعد تشریح مراتب اشتیاق و آرزو مندی کے تعزیت کے مضمون سے آنسو بھی بہاتا ہے۔ اور کچھ خوشی میں آکر مبارکباد کا مضمون بھی زبان پر لاتا ہے۔ زمانے میں خوشی

و غم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور دُنیا میں دھوپ چھاؤں کی طرح شادی کے ہاتھ میں ماتم کا ہاتھ ہے۔ دو پھول ایک ہی شاخ میں پھولتے ہیں۔ ایک دُولہا دُولہن کے سہرے کے کام آتا ہے۔ دُوسرا میّت کی تربت پر چڑھایا جاتا ہے! دو موتی ایک سیپ میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک کو بادشاہ کے تاج میں لگاتے ہیں۔ دوسرے کو کھرل میں پیس کر دوا میں ملاتے ہیں۔ ایک ہی کافور سے دو شمعیں بنتی ہیں۔ ایک محفل سرود کے کام آتی ہے۔ دُوسری مُردے کے مزار پر جلائی جاتی ہے۔ چمن میں کلی اگر کھِل کھِلا کر ہنستی ہے۔ شبنم بے اختیار اُس کے ہنسنے پر روتی ہے۔ جس باغ میں خزاں ہو۔ وہاں بہار بھی ہے۔ اور جہاں گُل ہو۔ وہاں خار بھی ہے۔ بادام کے پوست اور مغز کو دیکھیئے۔ کہ نرمی اور سختی ایک ہی جگہ نمود ہے۔ برف کو سوچیئے۔ تو گرمی اور سردی اس کے ساتھ ہی موجود ہے۔ سُرخی اور زردی گُلِ رعنا کی دلیل ہے۔ تقدیر نے اگر صبح کو لباسِ سفید خوشی کا پہنایا۔ تو شام کے واسطے جامۂ سیاہ ماتمی بنایا۔ حاصِل یہ کہ آپ کے والدِ ماجد نے عین عید کے دن انتقال فرمایا۔ گویا اسی گردش لیل و نہار کی خزاں و بہار کا تماشا

دکھایا۔ اور اس غم نے جتنا رلایا تھا۔ آپ کی شادی نے اُتنا ہی ہنسایا۔ اس افسوس میں آسمان جو ماتمی لباس پہنے نظر آیا۔ تو شفق کی سُرخی نے وہیں خوشی کا رنگ بھی دکھایا۔ رنج میں وہ ہتھڑ جو پہلے منہ پر مارا۔ تو پھر خوشی میں وہی دونوں ہاتھ اُٹھا کر یُوں دُعا مانگی۔ کہ خدا اس مرحوم کو جنت نصیب کرے۔ اور آپ سلامت رہیں۔ اور یہ شادی مبارک ہو۔ بندہ بھی ادائے رسمِ فاتحہ خوانی و شرکتِ محفلِ شادمانی کے واسطے ضرور حاضر ہوگا۔ زیادہ و السلام +

(۲۔ خان بہادر منشی غلام غوث بیخبر)

غلام غوث نام اور بیخبر تخلص تھا۔ آپ کے والد خواجہ حضور الله اپنے وطن کشمیر کو چھوڑ کر نیپال میں اقامت گزیں ہوئے۔ چنانچہ بیخبر وہیں ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ سرکار انگریزی میں عہدہ جلیلہ پر ممتاز رہے۔ ۱۸۸۵ء میں پنشن لی۔ اور خان بہادر ذوالقدر کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ اور ۱۹۰۵ء میں رحلت فرمائی +

آپ کی دو تصنیفیں یادگار ہیں۔ ایک "خونابۂ جگر" اور دُوسری "فغان بیخبر" +

بیخبر کا شمار عہد قدیم کے نامور انشا پردازوں میں

تھا۔ آپ کی عبارت میں بھی رنگینی اور تصنع ہے لیکن قوافی اور سجع کا خاص طور پر التزام نہیں کرتے۔ رعایت لفظی اور مبالغہ کا بہت شوق ہے۔

مولانا غلام امام شہید کے نام

قبلہ میری شوخی دیکھیئے! یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں۔ گلزار میں پھول لے جاتا ہوں۔ ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے روانی کے معنی بیان کر رہا ہوں۔ چاند کے روبرو نور افشانی کا معمہ حل کرتا ہوں۔ لعل کے حضور میں رنگ کی دکان کھولتا ہوں۔ قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں۔ مسیحا سے کہتا ہوں۔ جاں بخشی کی روایت سنیئے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں۔ کہ ید بیضا کی چمک دیکھیئے۔ یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لئے اس کا دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا۔ جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے۔ ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو میں مرے۔ اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارے سے حظ اٹھائے۔ گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے۔ مگر چونکہ غلبۂ شوق میں تمیز باقی نہیں رہتی۔ یہ خیال نہیں ہوتا۔ کہ میں کیا

ہوں - اور کیا کرتا ہوں - دیباچہ بھی لکھ ڈالا - وہ
اس کے قابل تو کلہے کو ہے - آپ کے دیوان پر میرا
دیباچہ ایسا ہے - جیسے موتی کی لڑی میں سنگریزہ کا
آویزہ لگا ہو - یا زربفت کی قبا میں چھینٹ کا حاشیہ
ٹکا ہو - مانی کی تصویر کے گرد ایک نومشق لکیریں
بنادے - سحبان کے کلام کی ایک ابجد خواں شرح
لکھادے - مگر اس نظر سے کہ ہر چیز اپنی ضد سے
پہچانی جاتی ہے - بدصورت کے مقابلہ میں حسین کے
حسن کو اور رونق ہوتی ہے - شب تار میں شمع کی
روشنی زیادہ ضیا دیتی ہے - کھاری پانی پینے کے بعد
قند کے شربت میں اور ہی مزا آتا ہے - صحرا نوردی
کے بعد باغ کا لطف کہا نہیں جاتا ہے - خاطر مشکل
پسند پسند کر لے - تو ہو سکتا ہے - بیشک دیکھنے
والوں کو اس کی بُرائی اُس کی خوبی زیادہ دکھاویگی
ستارہ دیکھ کے جو چاند دیکھے - اُسے روشنی زیادہ نظر
آئے گی - میری خوش طالعی ہے - اگر یہ قبول ہو
اس کے لئے شرف ہے - اگر دیوان میں داخل
ہونے کی عزّت اُسے حصول ہو +

(۳ - مرزا اسداللہ خاں غالب)

اسد اللہ خاں نام - مرزا نوشہ لقب - نجم الدولہ - دبیرالملک

نظام جنگ خطاب تھا - پہلے اسد تخلص تھا - پھر اسداللہ الغالب کی مناسبت سے غالب اختیار کیا - غالب ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے - بارہ تیرہ سال کی عمر میں اپنے چچا کے ہمراہ دہلی آئے - اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کی - کلکتہ - لکھنؤ اور رام پور کے سفر کئے۔ آخر ۱۸۶۹ء میں راہی ملک بقا ہوئے - اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیا (دہلی) کے متصل پیوند خاک ہوئے +

غالب اُردو و فارسی کے زبردست شاعر ہیں۔ آپکا اُردو دیوان اُردو کی ان مایۂ ناز تصانیف میں ہے - جن کو دُنیائے ادب کی الہامی کتابیں کہنا بیجا نہ ہوگا +

جہاں تک نثر کا تعلق ہے - غالب کا شمار محسنین اُردو میں کیا جاتا ہے - گو آپ نے کوئی علمی، ادبی، یا تنقیدی تصنیف نہیں چھوڑی - صرف آپ کے خطوط کے دو مجموعے "اردوئے معلیٰ" اور "عودِ ہندی" کے نام سے شائع ہوئے ہیں - لیکن ان ہی خطوط میں وہ سب کچھ ہے - جسے علمی - ادبی یا تنقیدی کہا جاتا ہے +

مرزا غالب نے ۱۸۵۰ء سے خط و کتابت اُردو میں کرنی شروع کی - آپ کے اُردو خطوط کی عبارت صاف - سادہ - سلیس - رواں اور بے تکلف ہوتی ہے۔ القاب و آداب کا پرانا طریقہ آپ نے قطعی ترک کر دیا۔ ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے - جیسے دو آدمی بیٹھے

بات چیت یا سوال جواب کرتے ہیں۔ خطوط غالب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اُن میں لطف بیان کی بدولت ناول اور ڈرامہ سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اور لطف یہ کہ غالب کی فطری شوخی نے ان خطوط کے اسلوب بیاں کو بڑی حد تک ناقابل تقلید بنا دیا ہے +

میر مہدی کے نام +

سیّد صاحب کل پہر دن رہے تمہارا خط پہنچا۔ یقین ہے۔ کہ اُسی وقت یا شام کو میر سرفراز حسین تمہارے پاس پہنچ گئے ہوں۔ حال سفر کا جو کچھ ہے۔ اُن کی زبانی سُن لوگے۔ میں کیا لکھوں۔ میں نے بھی جو کچھ سُنا ہے۔ اُن ہی سے سُنا ہے۔ اُن کا اِس طرح ناکام پھر آنا میری تمنّا اور میرے مقصود کے خلاف ہے۔ لیکن میرے عقیدے اور میرے تصور کے مطابق ہے۔ میں جانتا تھا۔ کہ وہاں کچھ نہ ہوگا۔ سو روپے کی ناحق زیر باری ہوئی۔ چونکہ یہ زیر باری میرے بھروسے پر ہوئی۔ تو مجھے شرمساری ہوئی۔ میں نے اِس چھیاسٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور رُوسیاہیاں بہت اُٹھائی ہیں۔ جہاں ہزار داغ ہیں۔ ایک ہزار ایک سہی۔ میر سرفراز حسین کی زیر باری سے دل کڑھتا ہے +

وبا کو کیا پوچھتے ہو۔ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں نہ ہو۔ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے۔ شعر

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ء کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اِس میں میری کسر شان تھی۔ بعد رفع فساد و وبا سمجھ لیا جائے گا۔

کلیات اُردو کا چھاپا تمام ہوا۔ اغلب کہ اِسی ہفتہ میں غایت اس مہینے میں ایک نسخہ بر سبیل ڈاک تم کو پہنچ جائے۔ کلیات نظم فارسی کے چھاپنے کی بھی تدبیر ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا۔ تو وہ بھی چھاپا جائے گا "قاطع برہان" کے خاتمہ میں کچھ فوائد بڑھائے گئے ہیں۔ اگر مقدور مساعدت کرے گا۔ تو میں بے شرکت غیر اِس کو چھپواؤں گا۔ مگر یہ خیال محال ہے۔ میرے مقدور کی تیاری کا حال مجتہد العصر کو معلوم ہے۔ واللہ علیٰ کل شئی قدیر۔ خُدا کا بندہ ہوں۔ علی کا غلام۔ میرا خُدا کریم۔ میرا خداوند سخی۔ علی دارم چہ غم دارم۔

وبا کی آنچ مدّھم ہو گئی ہے۔ پانچ سات روز بڑا زور و شور رہا۔ پرسوں خواجہ مرزا ولد خواجہ امان مع اپنی بی بی بچّوں کے دلّی میں آیا۔ کل رات کو اس کا نو برس کا بیٹا ہیضہ کر کے مر گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور ہیں بھی وبا ہے۔ الگزنڈر پدرنی مشتہر بہ الکہ صاحب مر گیا۔ واقعی بے تکلّف وہ میرا عزیز اور ترقی خواہ اور مزاج میں اور سمجھ میں متوسط تھا۔ اسی جرم میں ماخوذ ہو کر مرا۔ خیر یہ عالم اسباب ہے۔ اس کے حالات سے ہم کو کیا *

ایضاً

جانِ غالب! اب کی ایسا بیمار ہو گیا تھا۔ کہ مجھ کو خود افسوس تھا۔ پانچویں دن غذا کھائی۔ اب اچّھا ہوں۔ تندرست ہوں۔ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ تک کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ محرم کی پہلی تاریخ سے اللہ مالک ہے *

میر نصیر الدین آئے کئی بار۔ میں نے اُن کو دیکھا نہیں۔ اب کی بار درد میں مجھ کو غفلت بہت رہی اکثر احباب کے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ جب سے اچھا ہوا ہوں۔ سیّد صاحب نہیں آئے *

تمہارے آنکھوں کے غبار کی وجہ یہ ہے۔ کہ جو مکان دلّی میں ڈھائے گئے۔ اور جہاں جہاں سڑکیں

نکلیں - جتنی گرد اڑی - اُس کو آپ نے از راہِ محبت اپنی آنکھوں میں جگہ دی - بہر حال اچھے ہو جاؤ - اور جلد آؤ +

مجتہد العصر میر سر افراز حسین کا خط آیا تھا - میں نے میرن صاحب کی آزردگی کے خوف سے اس کا جواب نہیں لکھا - یہ رقعہ اُن دونوں صاحبوں کو پڑھا دینا - کہ میر سر افراز حسین صاحب اپنے خط کی رسید سے مطلع ہو جائیں - اور میرن صاحب میرے پاسِ الفت پر اِطلاع پائیں +

(۴ - آنریبل ڈاکٹر سر سیّد احمد خاں)

آپ کے خطوط بھی تصنع اور تکلّف سے آزاد ہوتے ہیں۔ عبارت صاف - سادہ - سلیس اور مدّلل ہوتی ہے - اور اندازِ بیان سنجیدہ اور عالمانہ +

خواجہ الطاف حسین حالؔی کے نام +

جناب مخدوم و مکرم من - عنایت نامہ جات مع بلیغ جلد مسدس پہنچے - جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی ! جب تک ختم نہ ہو لی - ہاتھ سے نہ چھوٹی ! اور جب ختم ہو لی - تو افسوس ہوا - کہ کیوں ختم ہو گئی - اگر اس مسدّس کی بدولت فنِ شاعری کی تاریخ جدید

قرار دی جاوے۔ تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے۔ بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے۔ کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ۔ جھوٹ۔ تشبیہات وور از کار سے جو مایۂ ناز شعرا و شاعری ہے۔ بالکل مبرّا ہے۔ کیونکہ ایسی خوبی و خوش بیانی اور مؤثر طریقہ پر ادا ہؤا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں۔ جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے۔ جو دِل سے نکلتی ہے۔ دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پُرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے۔ یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اِشارہ اس نثر میں ہے۔ اس کا شکر کرتا ہوں۔ اور آپ کی محبّت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پُرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے۔ تو صرف اِنہی الفاظ میں ہے۔ جن میں میری طرف اِشارہ ہے۔ بیشک میں اِس کا محرک ہؤا۔ اور اس کو مَیں اپنے اُن اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں۔ کہ جب خُدا پُوچھے گا۔ کہ تو کیا لایا۔ میں کہوں گا۔ کہ حالیؔ سے مسدّس لکھوا لایا ہوں۔ اور کچھ نہیں۔ خُدا آپ کو جزائے خیر دے۔ اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا

کریں - آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا - کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں - اور کیا لاگت لگی ہے - اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے - نہایت جلد آپ اِن جملہ امور سے مجھے مطلع فرمائیے - یہ بھی لکھیئے - کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب موجود ہیں *

آپ کے اِس خیال کا کہ حق تصنیف مدرستہ العلوم کو دیا جائے - اور رجسٹری کرا دی جائے - میں دل سے شکر گذار ہوں - مگر مَیں نہیں چاہتا - کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور یا اُن کے ماتم کا مرثیہ ہے - کسی قید سے مقید کیا جاوے - جس قدر چھپے - اور جس قدر وہ مشہور ہو - اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں - اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی پر گاویں - قوال درگاہوں میں گاویں - حال لانے والے اِس سچے حال پر حال لاویں - اُسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی - میرا تو دل چاہتا ہے - کہ دہلی میں ایک مجلس کروں - جس میں تمام اشراف ہوں - اور رنڈیاں بلواؤں - مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں - میں اس کُل مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا - میرے اُن اِستفسار کا جواب جن پر نشان درج کر دیا ہے بہت جلد مرحمت ہو - والسلام *

خاکسار آپ کا احسانمند تابعدار

سیّد احمد
شملہ۔ پارک ہوٹل۔ ۱۰۔ جون ۱۸۷۹ء

مولوی محمدؐ حسین آزاد کے نام +

مولوی صاحب۔ عزیز و شفیق و مکرم من سلامت۔ بعد سلام مسنون الاسلام اِلتماس یہ ہے۔ کہ آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ حالات مندرجہ سے اطلاع ہوئی۔ افسوس! صد افسوس۔ کہ کبھی مسلمانوں میں باہم اِتفاق نہ ہؤا۔ شعر و سُخن پر ردو قدح دوسری چیز ہے۔ اِلّا آپس کا اِتفاق دوسری چیز ہے۔ میری نہایت قدیم تمنّا اِس مجلس مشاعرہ سے بر آئی ہے۔ میں مدّت سے چاہتا تھا۔ کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی "خواب امن" پہنچی۔ بہُت دِل خوش ہؤا۔ اور حقیقت شاعری اور زور سخنوری کی داد دی ہے۔ اب بھی اِس میں خیالی باتیں بہُت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا۔ اتنا ہی مزا دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضرور ہے۔ کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اُردو زبان میں ادا کیے جاویں۔ یہ کام ہی ایسا مُشکل ہے۔ کہ کوئی کر تو دے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں۔ ہم

بیان کیا کر سکتے ہیں۔ بعد رمضان انشا اللہ تعالےٰ ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا۔ اِن دنوں میں بسبب صوم کچھ کام نہیں ہو سکتا۔ آپ کی اگر اور کوئی مثنوی علاوہ چھپی ہو۔ تو عنایت فرمایئے۔ والسلام ؛

خاکسار
سیّد احمد۔ از بنارس۔ ۲۹۔ اکتوبر ۱۸۸۴ء

(۵۔ نیاز فتح پوری)

نیاز فتح پوری۔ مشہور و معروف رسالہ "نگار" کے ایڈیٹر اور مالک ہیں۔ نثر میں آپ ایک خاص طرز اور اسلوب کے موجد ہیں۔ آپ کے خطوط "مکتوبات نیاز" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطوط کی طرز بیان سادہ اور بے تکلف ہے۔ عبارت میں شگفتگی اور بے ساختہ پن لُطف پیدا کر دیتا ہے ؛

کسی دوست کے نام

صدیق مکرم!
نامہ گرامی مِلا۔ اس پرسش حال کا شکریہ عرض کرتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ آپ ایسی ہستیاں دُنیا میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ خُدا آپ کو اُس وقت تک

صحیح و سلامت رکھے۔ جب تک ہم ایسے "جراحت خوردہ" دل موجود ہیں *

بیشک مجھ سے غلطی ہوئی۔ اور میں اس غلطی پر حد درجہ نادم ہوں۔ کہ آپ کو اپنے حال سے بے خبر رکھا۔ لیکن صرف اس خیال سے کہ خواہ مخواہ آپ کو تکلیف ہوگی۔ خاموش رہا۔ اب تفصیل سُن کر کیا کیجئے گا۔ اجمالاً یوں سمجھ لیجئے۔ کہ مر کر دوبارہ زندہ ہوا ہوں *

خاک۔ باد۔ آب و آتش چار عناصر مشہور ہیں۔ اور ان کے ذریعے سے جو اِنتہائی مصیبت کسی شخص پر آ سکتی ہے۔ وہ سب جھیل چکا ہوں۔ رات کا وقت ہے۔ اور جاڑوں کا زمانہ۔ کتاب دیکھتے دیکھتے سو جاتا ہوں۔ لمپ بھڑک اُٹھتا ہے۔ اور آگ پھیل کر لحاف توشک اور تکیوں کو نِصف سے زیادہ جلا دیتی ہے۔ لیکن میں بے خبر سوتا رہتا ہوں۔ آنکھ کھُلتی ہے جب کمرے کے اندر دُھواں گھُٹ کر پھیپھڑے کو کاربن سے بھر دیتا ہے۔ بچنے کی کیا صورت تھی۔ لیکن جسم گرم بھی نہیں ہوتا۔ جلنا کیا معنی۔ یہ واقعہ رام پور کا ہے*

اب خاک اور مٹی کی گرفت کو دیکھیئے۔ کدورہ سے مودہا گھوڑے پر جا رہا ہوں۔ راستے میں جاگیر بیری سے نکل کر جب دریا عبور کرتا ہوں۔ تو ساحل کے

ایک نالہ پر پہنچ کر گھوڑا دفعتہً "چور بالو" میں غرق ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گردن تک غائب۔ اور میں کمر تک۔ اب یہ یاد نہیں۔ کہ کیوں کر جان بچی۔

اَب ہَوا کا معاملہ سنیئے۔ اپنے وطن فتح پور میں ہوں۔ اور آموں کے باغ میں اِدھر اُدھر پھر رہا ہوں۔ کہ دفعتہً ہَوا کا طوفان آتا ہے۔ اور بڑے بڑے درخت اُکھڑ اُکھڑ کر گرنے لگتے ہیں۔ میں ایک شاخ سے لپٹ جاتا ہوں۔ وہ شاخ ٹوٹ کر گرتی ہے۔ اور اُس پر سارا درخت چڑ چڑا کر آ جاتا ہے۔ لیکن میَں صحیح و سلامت رہتا ہوں ٭

پانی کی مصیبت سُنیئے۔ کہ بارش کا زمانہ ہے۔ اور میں مُراد آباد سے رامپور آ رہا ہوں "رام گنگا" کو کشتی کے ذریعے سے عبور کرتا ہوں۔ اور بیچ دریا میں پہنچ کر کشتی کا تختہ توڑ کر پانی کی دھار بلند ہوتی ہے۔ ملاح اور تمام مسافر پانی نکال رہے ہیں۔ لیکن کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ آخرکار ساحل تک پہنچتے پہنچتے وہ غرق ہوتی ہے۔ اور سوائے میرے سب ڈوب جاتے ہیں۔ ایک اور واقعہ سنیئے۔ جس میں چاروں عناصر کی متفقہ قوّت ہلاک کرنا چاہتی ہے۔ میں فتح پور سے الہ آباد جا رہا ہوں۔ اور دو اسٹیشن آگے چل کر دوسری گاڑی کے اِنتظار میں ہماری گاڑی کھڑی ہو

جاتی ہے۔ آدمی پٹری بدلنا بھول جاتا ہے۔ اور تصادم ہو جاتا ہے۔

پھر وہ شخص جس کی سخت جانی کا علاج فطرت کی یہ قہرمانی قوتیں بھی نہ کر سکیں۔ اس پر معمولی امراض کے دورے کیا مؤثر ہو سکتے ہیں۔ یقیناً میری حالت بہت نازک ہو گئی تھی۔ بحران و ہذیان سبھی کچھ تھا لیکن مقابلے میں آخر کار مجھ ہی کو فتح نصیب ہوئی۔

آپ مبارک باد دیتے ہیں۔ اس لئے خوش ہوا جاتا ہوں۔ ورنہ جانتا ہوں۔ کہ اب فطرت کوئی ایسا زبردست حربہ استعمال کرنے والی ہے۔ کہ نہ آپ کی دعائیں کام آئیں گی۔ اور نہ میری سخت جانیاں۔

بہر حال ابھی تو زندہ ہوں۔ اور مرنے کے بظاہر کوئی آثار موجود نہیں۔ لیکن آخر کب تک۔ جس خدا نے حسین کو شہید کر دیا۔ وہ مجھ ایسے معمولی انسان کو کیوں چھوڑنے لگا۔

کسی نو مشق موزوں طبع کے نام

عزیزم!

تمہاری شاعری سے تمہیں کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو! لیکن مجھے ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ اس بہانے سے کبھی کبھی تمہاری خیریت معلوم ہو جاتی ہے۔ مجھے

تو یاد نہیں پڑتا۔ کہ تم نے کبھی کوئی خط ایسا لکھا ہو۔ جس میں کوئی غزل ملفوف نہ ہو۔ اور اصلاح کی خواہش نہ کی گئی ہو۔ پھر اسی کے ساتھ میں تمہارے صبر و استقلال کا بھی قائل ہوں۔ کہ میں نے کبھی تمہاری خواہش پوری نہیں کی۔ لیکن تم نے کبھی مایوس ہو کر اِس سلسلہ کو ختم نہیں کیا۔ تاہم یہ سوچتا ہوں۔ کہ آخر کب تک میں ٹالتا رہوں گا۔ اور تمہیں کب سمجھ آئے گی۔ کہ میری خاموشی کو۔ اور کچھ نہیں تو میری نا اہلی ہی پر محمول کرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ میں شعر و شاعری ایک زمانہ ہؤا ترک کر چکا ہوں۔ اور مشکل ہی سے کسی کا کوئی شعر مجھے پسند آتا ہے۔ اس کو میرے معیار کی بلندی کہو۔ خبط کہو۔ بے حسی سے تعبیر کرو۔ بہر حال جو کچھ سمجھو۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ میرا دِل اِس فن سے اُچاٹ ہو چکا ہے۔ اور دل و دماغ کے سامنے اور اتنے اہم مشاغل موجود ہیں۔ کہ اس طرف توجہ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ پھر اسی کے ساتھ جب تمہاری غزلوں کو دیکھتا ہوں۔ تو ان میں اصلاح کی بھی کوئی گنجائش نہیں پاتا۔ کیونکہ اِصلاح کا مقصود تو جا بجا اسقام کو دُور کرنا ہے۔ لیکن جس میں تلاش سے بھی کوئی معقول بات نظر نہ آئے۔ اُس کی اصلاح تو صرف اِسی طرح ممکن ہے۔ کہ از سر نو دوسری لِکھ

دی جائے۔ پھر بتاؤ! کیا مجھے سودا ہے۔ کہ میں خواہ مخواہ تمہیں غزلیں کہہ کہہ کر دیا کروں۔ اور تم کو فریب نفس میں مبتلا کروں۔ جس کی خیر سے یوں بھی تم میں کوئی کمی نہیں۔ پاگل ہوئے ہو۔ اپنا کام کرو۔ اور اس خبط کو چھوڑو۔ نہ تمہاری تعلیم پوری ہے نہ تمہاری صحبت معقول۔ نہ تمہارا ماحول ٹھکانے کا۔ پھر جو یہ خبط تم پر سوار ہے۔ تو کیوں؟

اگر تم کو میرے ساتھ کوئی علاقہ ایسا ہے۔ جو کبھی کبھی خیریت لکھنے اور دریافت کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ تو اس قسم کی مراسلت میرے لئے یقیناً باعث مسرت ہو سکتی ہے۔ لیکن محض "غزل بازی" کے لئے کیوں اپنے پیسوں کا اور میرے دل کا خون کرتے ہو؟

۵۔ شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار

(شمس العلماء مولانا مولوی محمدؐ حسین صاحب آزاد)

محمدؐ حسین نام ۔ آزاد تخلص ۔ خلف مولوی محمدؐ باقر خاص دہلی کے رہنے والے تھے ۔ ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے آزاد نے ابتدائی تعلیم حضرت ذوقؔ کے سایۂ عاطفت میں پائی ۔ بعد ازاں دہلی کالج میں داخل ہو گئے ۔ اور علوم مروجہ حاصل کیے ۔

تحصیل علم سے فارغ ہو کر آزاد بہ تلاش روزگار لاہور پہنچے اور وہاں سررشتۂ تعلیم میں ملازم ہو گئے ۔ لیکن اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت روز بروز ترقّی کرتے رہے ۔ آخر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی کے پروفیسر مقرّر ہو گئے تھے ۔

آخری عمر میں آزاد کی صحت جواب دے چکی تھی ۔ ۱۸۸۹ء میں جنون کے آثار پیدا ہوئے ۔ رفتہ رفتہ یہ مرض پختہ ہو گیا ۔ اور آخر اسی حالت میں آزاد ۱۹۱۰ء میں قید ہستی سے آزاد

ہو گئے ۔

آزاد اُردو شعروشاعری کے دَور جدید کے بانی تھے۔ لیکن اُردو نثر پر جو احسانات آپ نے کئے۔ وہ تاریخ ادب میں ہمیشہ سنہرے حرفوں میں لکھے جائیں گے۔ اِن ہی ادبی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ نے آپ کو ۱۸۸۷ء میں شمس العلماء کا خطاب مرحمت فرمایا ۔

اُردو قاعدے۔ قواعد اُردو۔ قصص الہند وغیرہ کے علاوہ مولانا آزاد کی مندرجہ ذیل تصنیفات پر اُردو زبان نہ ادب کو فخر ہے ۔

۱۔ **آب حیات**۔ اُردو شعر و سُخن کی تاریخ ہے۔ اور شعرا کے کلام پر تنقید بھی کی گئی ہے ۔

۲۔ **نیرنگِ خیال**۔ انگریزی تمثیلی افسانوں کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ اس میں متعدد مضامین ہیں ۔

۳۔ **دربار اکبری**۔ شہنشاہ اکبر کے عہد کی تاریخ ہے ۔

۴۔ **سخندان پارس**۔ علم السنہ پر لکھی گئی ہے ۔

مولانا آزاد کا طرز تحریر قدیم و جدید عہد کے مصنفین کے طرز تحریر کے درمیان اعتدال کی عمدہ مثال ہے۔ نہ تو وہ اس قدر رنگین ہے۔ کہ تصنع اور آورد کا عیب آنے پائے۔ اور نہ اس قدر عاری کہ خشکی اور بے لطفی کی شکایت ہونے پائے۔ آپ کی طرز تحریر کی بنیاد

شیرینئ زبان - صحت محاورہ اور دِل کشئ تشبیہہ و استعارہ پر ہے - عبارت میں سادگی اور بے تکلفی سے حسن پیدا ہو جاتا ہے - مولانا کو جذبات نگاری پر پوری قدرت حاصل ہے - آپ کی نثر میں نظم کا لُطف ہے - اور جملوں میں شعر کا سا اثر ہے +

آزاد کا اسلوب بیان جس قدر دلچسپ ہے - اُسی قدر ناقابل تقلید بھی ہے - اس اسلوب میں ایک خامی بھی ہے - اور وہ یہ کہ یہ طرز محض قصّہ کہانیوں اور افسانوں ہی کے لیئے موزوں ہو سکتا ہے - علمی - فلسفی و تاریخی مطالب کے لیئے یہ طرز اختیار نہیں کیا جا سکتا - آزاد کی جملہ تصانیف ناول سے زیادہ پُر لطف اور ڈرامے سے زیادہ دلچسپ ہیں - لیکن ان خوبیوں کی بنیاد حضرت آزاد کی بے مثل انشا پردازی پر ہے - نہ کہ عالمانہ تحقیق و حکیمانہ سنجیدگی پر +

مضمون ذیل "نیرنگ خیال" سے لیا گیا ہے +

اَے ملک فنا کے رہنے والو! دیکھو - اس دربار میں تمہارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں - بہت سے حب الوطن کے شہید ہیں - جنہوں نے اپنے مُلک کے نام پر میدانِ جنگ میں جا کر خونی خلعت پہنے - اکثر مصنف اور شاعر ہیں - جنہیں اُسی ہاتف غیبی کا خطاب زیبا ہے - جس کے الہام

سے وہ مطالب غیبی ادا کرتے رہے۔ اور بے عیبی سے زندگی بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں۔ جو بزم تحقیق کے صدر اور اپنے عہد کے باعث فخر رہے۔ بہت سے نیک بخت نیکی کے رستے بتلاتے رہے۔ جس سے ملک فنا میں بقا کی عمارت بناتے رہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی۔ کہ اُس کے لئے فنا نہیں۔ دوسری وہ عالم یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر جیتے ہیں۔ اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے۔ کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے۔ یا تو ثواب آخرت کے لئے یا دُنیا کی ناموری اور شہرت کے لئے ہوئے۔ لیکن میں اِس دربار میں اُنہی لوگوں کو لاؤں گا۔ جنہوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دُنیا کی شہرت اور ناموری کو سمجھا۔ اور اِسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے۔ اُن کے نام شہرت کی فہرست سے نکال ڈالتا ہوں۔ مگر بڑا فکر یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں۔ اُن کی حق تلفی نہ ہو جائے۔ کیونکہ جن بیچاروں

نے ساری جانفشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا۔ اُن کے حصّہ میں کسی طرح کا نقص ڈالنا سخت ستم ہے۔ اِسی لحاظ سے مجھے تمام مصنّفین اور مورّخین سے مدد مانگنی پڑی۔ چنانچہ اکثروں کا نہایت احسان مند ہوں۔ کہ انہوں نے ایسے ایسے لوگوں کی فہرست بناکر عنایت کی۔ اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اُسی کے مقابلے میں گذری۔ ناموران موصوف کے حالات ایسے دِل پر چھائے ہوئے تھے۔ کہ اُنہوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اُس عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ چونکہ بیان اُس کا لُطف سے خالی نہیں۔ اس لیۓ عرض کرتا ہوں ✦

خواب میں دیکھتا ہوں۔ کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں۔ اور چلتے چلتے ایک میدان[1] وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں۔ جس کی وسعت اور دِلفزائی میدانِ خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں۔ کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں۔ کہ نہ اُنہیں محاسب فکر شمار کر سکتا ہے۔ نہ قلم تحریر فہرست تیار کر سکتا ہے۔ اور جو لوگ اِس میں جمع ہیں۔ وُہ غرض مند لوگ ہیں۔ کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں

[1] اس میدان کو میدان دُنیا سمجھ لو (نوٹ مصنّف) ✦

میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے۔ جس
کی چوٹی گوش سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔
پہلو اِس کے جس طرف سے دیکھو۔ ایسے سر پھوڑ اور
سینہ توڑ ہیں۔ کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے
ہاں حضرت اِنسان کے ناخن تدبیر کچھ کام کر جائیں
تو کر جائیں۔ میرے دوستو! اس رستہ کی دشواریوں
کو سر پھوڑ اور سینہ توڑ پہاڑوں سے تشبیہ دے کر
ہم خوش ہوتے ہیں۔ مگر بڑی نا منصفی ہے۔ پتھر
کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کرے۔ تو اِن بلاؤں کو
جھیلے۔ جن پر وہ مصیبتیں گذریں۔ وہی جانیں۔ یکایک
قلّہ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی
یہ دلکش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی
اِس طرح کہ دِل میں جان اور جان میں زندہ دِلی
پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی
رفعت دیتی تھی۔ جس سے انسان مرتبۂ انسانیت سے
بھی بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات
تھی۔ کہ اتنے انبوہ کثیر میں سے تھوڑے ہی اشخاص
تھے۔ جن کے کان اس کے سُننے کی قابلیت یا اُس
کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے ؞

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجّب ہوا
اور وہ تعجّب فوراً جاتا بھی رہا۔ یعنی دوسری طرف

جو نظر پڑی - تو دیکھتا ہوں - کہ کچھ خوبصورت عورتیں ہیں - اور بہت سے لوگ اُن کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں - یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں - مگر یہ بھی وہیں چرچا سُنا - کہ در حقیقت نہ وہ پریاں ہیں - اور نہ پری زاد عورتیں - کوئی ان میں غفلت کوئی عیاشی ہے - کوئی خود پسندی کوئی بے پروائی ہے - جب کوئی ہمّت والا ترّقی کے رستے میں سفر کرتا ہے - تو یہ ضرور ملتی ہیں - اُنہی میں پھنس کر اہل ترّقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں - ان پر درختوں کے جھُنڈ سایہ کئے تھے - رنگ برنگ کے پھُول کھلے تھے - گوناگوں میوے جھوم رہے تھے - طرح طرح کے جانور بول رہے تھے - نیچے قدرتی نہریں اور اُوپر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں - وہیں وہ دانش فریب پریاں پتھروں کی سلوں پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں - اور آپس میں چھینٹے اڑا رہی تھیں - مگر ایسے ایسے اُلجھاوے بلندی کوہ کے اِدھر ہی اِدھر تھے - یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا - کہ جو لوگ اِن جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں - وہ اگرچہ اقوامِ مختلف عہدہ ہائے متفرقہ - عمر ہائے متفاوتہ رکھتے ہیں - مگر وہی ہیں - جو حوصلے کے چھوٹے - ہمّت کے ہیٹے اور طبیعت کے پست ہیں *

دُوسری طرف دیکھا۔ کہ جو بلند حوصلہ صاحبِ ہمّت عالی طبیعت تھے۔ وہ اِن سے الگ ہو گئے۔ اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندی کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے۔ اُسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہُوا۔ کہ بہُت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اِس اِرادہ سے آگے بڑھے۔ کہ بلندی کوہ پر چڑھ جائیں۔ اور جس طرح ہو سکے۔ پاس جا کر اس نغمۂ آسمانی سے قوتِ روحانی حاصِل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھُ چیزیں اپنے ساتھ لینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا آگے کے راستہ کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا۔ کسی کے ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی۔ ایک ہاتھ میں نشان تھا کِسی کے ہاتھوں میں کاغذوں کے اجزا تھے۔ کسی کے بغل میں ایک کمپاس تھی۔ کوئی پنسلیں لئے تھا۔ کوئی جہازی قطب نما دُوربین سنبھالے تھا۔ بعضوں کے سر پر تاج شاہی دھرا تھا۔ بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ تھا۔ غرضیکہ علمِ ریاضی اور جرِّ ثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا۔ جو اس وقت کام میں نہ آ رہا ہو۔ اسی عالم میں دیکھتا ہوں۔ کہ ایک فرشتۂ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے۔ اور مجھے

بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے۔ کہ یہ سرگرمی اور گرمجوشی تمہاری ہمیں نہایت پسند ہے۔ اُس نے یہ بھی صلاح دی۔ کہ ایک نقاب مُنہ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامّل تعمیل کی۔ بعد اُس کے گروہ مذکور فرقہ فرقہ میں منقسم ہو گیا۔ کوہ مذکور پر رستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑ لی۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا۔ کہ چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں ہو لئے۔ وُہ تھوڑی ہی دُور چلے تھے۔ کہ اِن کا راستہ ختم ہؤا۔ اور وُہ تھم گئے۔ مجھے معلوم ہؤا۔ کہ اِن پست ہمتّوں نے صنعتگری اور دستکاری کی راہ لی تھی۔ کہ روپے کے بھوکے تھے۔ اور جلد محنت کا صلہ چاہتے تھے۔ میں اِن لوگوں کے پیچھے تھا۔ جنہوں نے دلاوروں اور جانبازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا تھا۔ اور خیال کیا تھا۔ کہ پڑھائی کے رستے ہم نے پا لئے۔ مگر وہ رستے ایسے پیچ در پیچ اور درہم برہم معلوم دیئے۔ کہ تھوڑا ہی آگے بڑھ کر اس کے ہیر پھیر میں سرگرداں ہو گئے۔ ہر چند برابر قدم مارتے جاتے تھے۔ مگر جب دیکھا۔ تو بہت کم آگے بڑھتے تھے۔ میرے فرشتہ رحمت نے ہدایت کی۔ کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ جہاں عقل صادق اور عزم کامل کام دیتا ہے۔ وہاں چاہتے

ہیں۔ کہ فقط چالاکی سے کام کر جائیں۔ بعضے ایسے بھی تھے۔ کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ مگر ایک ہی قدم ایسا پڑا۔ کہ جتنا گھنٹوں میں چڑھے تھے۔ اُتنا دم بھر میں نیچے آن پڑے۔ بلکہ بعضے ایسے ہو گئے۔ کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اِس سے وہ لوگ مُراد ہیں۔ کہ جو مدد روزگار سے ترقّیاں حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر کوئی ایسی حرکت ناشائستہ کرتے ہیں۔ کہ دفعتہً گر پڑتے ہیں۔ اور آیندہ کے لئے بالکل اِس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہم اتنے عرصہ میں بہت اُونچے چڑھ گئے۔ اور معلوم ہُوا۔ کہ جو چھوٹے بڑے رستے پہاڑ کے نیچے سے چلتے ہیں۔ اُوپر آکر دو شاہراہوں سے ملتے ہیں۔ چنانچہ وہاں آکر تمام صاحب ہمّت دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ اِن دونوں شاہراہوں میں ذرا ذرا آگے بڑھ کر ایک ایک بھوت ڈراؤنی صورت ہیبتناک صورت کھڑا تھا۔ کہ آگے جانے سے روکتا تھا۔ اِن میں سے ایک کے

ؔ فی الحقیقت جو ناموری اور ترقّی کے خواہاں ہیں۔ اگر سلطنت حکومت دولت۔ شجاعت۔ علمیت وغیرہ کے رستے سے چاہتے ہیں۔ تو خوف جان ہے۔ اگر اور فنون کمال کے رستے لیتے ہیں۔ تو حاسد انواع و اقسام کی بد ذاتیوں سے سد راہ ہوتے ہیں (نوٹ مُصنّف)۔

ہاتھ میں ایک درخت خاردار کا ٹہنا تھا۔ بھوت کا نام دیو ہلاک تھا۔ اور کانٹے وہی ترقی کے مانع اور موت کے بھلانے تھے۔ جو اولوالعزموں کو راہ ترقی میں پیش آتے ہیں۔ چنانچہ جو سامنے آتا تھا۔ ٹہنے کی مار منہ پر کھاتا تھا۔ دیو کی شکل ایسی خونخوار تھی۔ گویا موت سامنے کھڑی ہے۔ اِن کانٹوں کی مار سے غول کے غول اہل ہمت بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے۔ اور ڈر ڈر کر چلّاتے تھے۔ کہ ہے ہے موت! ہے ہے موت!! دوسرے راستے پر جو بھوت تھا۔ اس کا نام حسد تھا۔ پہلے بھوت کی طرح کچھ اُس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ لیکن ڈراونی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب کلمے جو اُس کی زبان سے نکلتے تھے۔ اس لئے اُس کا منہ ایسا بُرا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اُس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ اُس کے سامنے ایک کیچڑ کا حوض بھرا تھا۔ کہ برابر چھینٹے اُڑائے جاتا تھا۔ اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا۔ تو اکثر اشخاص ہم میں سے بے دل ہو کر رہ رہ گئے۔ اور بعضے اپنے یہاں تک آنے پر کمال نادم ہوئے۔ میرا یہ حال تھا۔ کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دِل ہراساں ہوا جاتا تھا۔ اور قدم آگے نہ اُٹھتا تھا۔ اِتنے میں اُس شہنائی کی آواز اِس

تیزی کے ساتھ کان میں آئی۔ کہ بجھے ہوئے ارادے
پھر چمک اٹھے۔ جس قدر کہ زندہ دل ہوئے۔ اُسی
قدر خوف و ہراس خاک ہو ہو کر اُڑاتے گئے۔ چنانچہ
بہت سے جانباز جو شمشیریں علم کئے ہوئے تھے۔
اِس کڑک دمک سے قدم مارتے آگے بڑھے۔ گویا
حریف سے میدانِ جنگ مانگتے ہیں۔ یہاں تک کہ
جہاں دیو کھڑا تھا۔ یہ اُس دہانہ سے نِکل گئے۔ اور
وہ موت کے دانت نِکالے دیکھتا رہ گیا۔ جو لوگ
سنجیدہ مزاج اور طبیعت کے دھیمے تھے۔ وُہ اُس
راستے پر پڑے۔ جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا۔ مگر
اِس آواز کے ذوق و شوق نے اُنہیں بھی ایسا ہست
کیا۔ کہ گالیاں کھاتے۔ کیچڑ میں نہاتے مَر پچ کر یہ
بھی اُس کی حد سے نِکل گئے۔ چنانچہ جو کچھ راستے
کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں۔ وُہ بھی بھوتوں تک
ہی تھیں۔ آگے دیکھا۔ کہ ان کے دست رس سے
باہر ہیں۔ اور راستہ بھی صاف اور ہموار بلکہ ایسا خوشنما
ہے۔ کہ مسافر جلد جلد آگے بڑھے۔ اور ایک سپاٹے
میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ اِس میدان روح
افزا میں پہنچتے ہی ایسی جان بخش اور روحانی ہوا چلنے
لگی۔ جس سے روح اور زندگانی کو قوت دوامی حاصل
ہوتی تھی۔ تمام میدان جو نظر کے گردوپیش دِکھائی

دیتا تھا۔ اس کا رنگ کبھی نور سحر تھا۔ اور کبھی شام و شفق۔ جس سے قوسِ قزح کے رنگ میں کبھی شہرتِ عام اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور و سرور کا عالم دِل کو اِس طرح تسلّی و تشفی دیتا تھا۔ کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دِل سے دھوئے جاتے تھے۔ اور اس مجمع عام میں امن و امان اور دِلی آرام پھیلتا تھا۔ جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہوکر عیاں تھا۔ ناگہاں ایک ایوان عالیشان دکھائی دیا۔ کہ اُس کے چار طرف پھاٹک تھے۔ اُس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا۔ کہ پھولوں کے تختے میں ایک پری حور شمائل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے۔ اور وہی شہنائی بجا رہی ہے۔ جس کے میٹھے سُروں نے اُن مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری اُن کی طرف دیکھ کر مُسکراتی تھی۔ اور سُروں سے اب ایسی صدا آتی تھی۔ گویا آنے والوں کو آفرین اور شاباش دیتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ کہ "خیر مقدم۔ خیر مقدم! خوش آمدید۔ صفا اور دید۔ اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ چنانچہ مورّخوں کا گروہ ایک دروازہ پر ایستادہ ہؤا۔ تاکہ صاحب مراتب اشخاص کو حسب مدارج ایوان جلوس میں داخل کرے۔ یکایک وہ شہنائی

جس سے کبھی شوق انگیز جوش خیز اور جنگی باجوں کے سُر نکلتے تھے۔ اب اُس سے ظفر یابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا۔ اور دروازے خودبخود کھل گئے۔ جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا۔ معلوم ہوا۔ کہ کوئی راجوں کا راجہ مہاراج ہے۔ چاند کی روشنی چہرے کے گرد ہالہ کئے ہے۔ سر پر سورج کی کرن کا تاج ہے۔ اُس کے اِستقلال کو دیکھ کر لنکا کا کوٹ پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ اُس کی حق داری جنگل اور حیوانوں کو جاں نثاری میں حاضر کرتی ہے۔ تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سایہ میں لئے آتے ہیں۔ فرقہ فرقہ کے علماء اور مورّخ اسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے اِسے لینے کو بڑھے۔ اور وُہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا۔ مگر ایک شخص کہن سالہ۔ رنگت کا کالا۔ ایک پوتھی بغل میں لئے۔ ہندوؤں کے غول سے نکلا۔ اور باآواز بلند چلّایا۔ کہ آنکھوں والو کچھ خیر ہے۔ دیکھو دیکھو۔ ترتیب کے سلسلے کو برہم نہ کرو۔ اور نرنکار کے نور کو اجسام خاک میں نہ ملاؤ۔ یہ کہہ کر آگے بڑھا۔ اور اپنی پوتھی نذر گزرانی۔ اُس نے نذر قبول کی۔ اور نہایت خوشی سے اس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ اس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا

سب ایک دُوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے۔ کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا[1]۔ اس وقت ایک بمان یعنی تخت ہوا دار آیا۔ وہ اس پر سوار ہو کر آسمان کو اُڑ گیا۔ معلوم ہوا۔ کہ یہ رامچندر جی ہیں۔ اور یہ والمیک ہے۔ جس نے راماین نذر دی۔ سب لوگ ابھی والمیک کی ہدایت کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں ایک اور آمد آمد ہوئی۔ دیکھا۔ کہ ایک تخت طلسمات کو بتیس پریاں اُڑائے لئے آتی ہیں۔ اس پر ایک اور راجہ بیٹھا ہے۔ مگر دیرینہ سال اسے فرقہ فِرقہ کے مورخ اور علماء لینے کو نکلے۔ مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بے قراری سے دَوڑے۔ معلوم ہوا۔ کہ راجہ تو مہاراجہ بکرماجیت تھے۔ اور تخت سنگھاسن بتیسی۔ پریاں اِتنی بات کہ کر ہوا ہو گئیں۔ کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے۔ نہ آپ کا سنہ ہٹے گا۔ اور نہ سِکہ مٹے گا۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی۔ اور اُنہیں لے جاکر ایک مسند پر بِٹھا دیا +

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں قیل و قال ہوئی کیونکہ وہ چاہتا تھا۔ کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ

---

[1] کوئی اوتار کہتا ہے۔ کوئی بادشاہ با اقبال (نوٹ مصنّف) +

لے جائیے۔ اور اراکین دربار کہتے تھے۔ کہ یہاں تمکنت اور غرور کا گذر نہیں۔ اتنے میں وہی بتیس پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ ان کی سفارش سے اُسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجہ نے مسند پر قدم رکھا۔ ایک پنڈت آیا۔ دونوں ہاتھ اُٹھا کر آشیرباد کہی۔ اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا۔ جس میں ہیرے اور پنّے کے نو دالنے ستاروں پہ آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا۔ کہ وُہ راجہ بھوج تھے۔ اور بتیّس پریوں کا جھُرمٹ وہی کتاب سنگھاسن بتیسی تھی۔ جو اِن کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ اور جس نے تاج سر پہ رکھا۔ وُہ کالیداس شاعر تھا۔ جس نے ان کے عہد میں نو کتابیں لِکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگئی جاوید بخشی ہے۔ اُس طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھے! اِتنے میں معلوم ہوا۔ کہ دوسرے دروازے سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اُس طرف متوجہ ہوا۔ دیکھتا ہوں۔ کہ وہ کمرہ بھی فرش و فروش جھاڑ فانوس سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ ایک جوان پیل پیکر ہاتھ میں گرزِ گاؤسر نشۂ شجاعت میں مست جھومتا جھامتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے۔ ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے۔ گرد اس کے شاہانِ کیانی اور پہلوانانِ ایرانی موجود ہیں۔ کہ درفش کاویانی کے

سایۂ بے زوال میں لیئے آتے ہیں۔ حبِّ قوم اور حُبِّ وطن اس کے دائیں بائیں پھول برساتے تھے اس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا۔اور سر پر کلّہ شیر کا خودِ فولادی دھرا تھا۔ مورّخ اور شعرا اُس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔سب نے اُسے بچشم تعظیم دیکھا۔ انہی میں سے ایک پیر مرد دیرینہ سال جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار آشکارا تھے۔ وہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ اور کرسی پر بٹھایا۔ جسے بجائے پالیوں کے چار شیر کندھوں پر اُٹھائے کھڑے تھے۔ پھر پیر مرد نے اہلِ مجلس کی طرف متوجہ ہو کر چند اشعار نہایت زور شور سے پڑھے۔ نہیں۔ بلکہ اُس کے کارناموں کی تصویر صفحہ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی۔ جو قیامت تک رہے گی۔ بہادر پہلوان نے اُٹھ کر اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اور گلِ فردوس کا ایک طرّہ اُس کے سر پر آویزاں کرکے دُعا کی۔ کہ الٰہی یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے۔ تمام اہل مجلس نے آمین کی ✤

معلوم ہوُا۔ کہ وہ بہادر ایران کا حامی۔ شیرِ سیستانی رستم پہلوان ہے۔ اور کہن سالہ مایوس فردوسی ہے۔ جو شاہنامہ لکھ کر اُس کے انعام سے محروم رہا ✤

بعد اُس کے ایک نوجوان آگے بڑھا۔ جس کا حسنُ شباب نوخیز اور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا۔ سر پر تاج شاہی تھا۔ مگر اِس سے ایرانی پہلوانی پہلو چرُاتی تھی۔ ساتھ اُس کے حکمت یونانی سر پر چتر لگائے تھی۔ مَیں نے لوگوں سے پوچھا۔ مگر سب اُسے دیکھ کر ایسے محو ہُوئے۔ کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہُت سے مورّخ اور محقق اُس کے لینے کو بڑھے مگر سب ناواقف تھے۔ وُہ اُس تخت کی طرف لے چلے۔ جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لئے تیار ہُوا تھا۔ چنانچہ ایک شخص جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا۔ ایک انبوہ کو چیر کر نکلا۔ وہ کوئی یونانی مورّخ تھا۔ اُس نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جاکر سب سے پہلی کرُسی پر بٹھایا! فرشتہ رحمت نے میرے کان میں کہا۔ کہ تمُ اس گوشے کی طرف آ جاؤ۔ تاکہ تمہاری نظر سب پر پڑے۔ اور تمہیں کوئی نہ دیکھے۔ یہ سکندر یونانی ہے جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دِئے ہیں *

اِس کے پیچھے پیچھے ایک بادشاہ آیا۔ کہ سر پر کلّاہ کیانی اور اُس پر دُرفش کاویانی جھومتا تھا۔ مگر پھریرا عَلم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وُہ آہستہ آہستہ

اس طرح آتا تھا - گویا وہ اپنے زخم کو بچائے ہوئے آتا ہے - رنگ زرد تھا - اور شرم سے سر جھکائے تھا - جب وہ آیا - تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اُٹھا - اور اپنے برابر بٹھایا - باوجود اُس کے سکندر جس قدر تعظیم کرتا تھا - اُس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی - وہ دارا شاہ ایران تھا *

دفعتہً سکندر نے آواز دی "انہیں لاؤ" جو شخص داخل ہؤا - وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا - کہ مقیشی ڈاڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اُس کے چہرے کو روشن کیا تھا - ہاتھ میں عصائے پیری تھا - جس وقت وہ آیا - سکندر خود اٹھا - اُس کا ہاتھ پکڑ کر لایا - اپنے برابر کرسی پر بٹھایا - اور پانچ لڑی کا سہرا اُس کے سر پر باندھا - معلوم ہؤا - کہ یہ نظامی گنجوی ہیں - اور اس سہرے میں خمسہ کے مضامین کے پھول پروئے ہوئے ہیں - سکندر پھر اُٹھا - اور تھوڑا سا پانی چھڑک کر کہا - اب یہ کبھی نہ کملائینگے *

بعد اس کے جو شخص آیا - اگرچہ سادہ وضع تھا - مگر قیافہ روشن اور چہرہ فرحت روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا - جو لوگ اب تک آ چکے تھے - اُن سب سے زیادہ عالی رُتبے کے لوگ اس کے ساتھ تھے - اُس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا - اور بائیں پر

جالینوس ۔ اس کا نام سقراط تھا ۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا ۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے ۔ کہ ارسطو اپنے اُستاد یعنی افلاطون سے دوسرے درجے پر بیٹھے گا مگر اس مقدمے پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ اُن کا سرگروہ خود ارسطو تھا ۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے مگر دلائل زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہل محفل کو قائل کر کر لیا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے اور یہ کہ کر اوّل سکندر کو آئینہ دکھایا اور پھر نظامی کو سلام کر کے بیٹھ ہی گیا +

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کا ذیل میں آیا ۔ سب جبّہ و عمامہ طبل و دمامہ رکھتے تھے ۔ مگر باہر رہ گئے کیونکہ ہر چند اُن کے جبّے دامن قیامت سے دامن باندھے تھے اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے ۔ مگر اکثر اُن میں طبل تہی کی طرح اندر سے خالی تھے ۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لئے منتخب ہوئے ۔ اُن کے ساتھ ایک انبوہ کثیر علماء فضلاء کا ہو لیا ۔ تعجب یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اُتارے اُن کے ساتھ تھے بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لئے آشیرباد کہتے آتے تھے ۔ پہلا بادشاہ اُن میں ہارون الرشید اور دوسرا مامون الرشید تھا +

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ایک اور تاجدار سامنے سے نمودار ہؤا۔ ولایتی استخوان اور ولایتی لباس تھا اور جامہ خون سے قلمکار تھا۔ ہندوستان کے بہت سے گرانبہا زیور اُس کے پاس تھے۔ مگر چونکہ ناواقف تھا۔ اِس لئے کچھ زیور ہاتھ میں لئے تھا۔ کچھ کاندھے پر پڑے تھے۔ ہر چند یہ جواہرات اپنی آبداری سے پانی ٹپکاتے تھے۔ مگر جہاں قدم رکھتا تھا بجائے غبار کے آہوں کے دُھوئیں اُٹھتے تھے۔ وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے مُصنّف اُس کے اِستقبال کو بڑھے مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوان حور شمائل آیا اور فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمُود کے سامنے لے گیا۔ محمُود نے نہایت اشتیاق اور شُکر گذاری سے ہاتھ اُس کا پکڑا۔ اگرچہ برابر بیٹھ گئے۔ مگر دونوں کی نگاہیں شرم سے جُھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مُسکرایا۔ اور چلا گیا۔ وہ ایاز تھا۔ اسی عرصہ میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہلِ اسلام کا رکھتا تھا مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملاتا تھا۔ اُس کے داخل ہونے پر شعراء تو الگ ہو گئے۔ مگر تمام علماء اور فضلاء میں تکرار اور قیل و قال کا غُل ہؤا۔ اُس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا اور ارسطو کے مُقابل میں ایک کرسی بچھی تھی

اُس پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بُو علی سینا تھا۔

ایک انبوہ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے۔ مگر انداز ہر ایک کے جُدا جُدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق اُن کے نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معنی و مضامین کے مُصوّر ہیں۔ اُن کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب مِلا۔ کہ تمُ مُصوّر بے شک اچھے ہو مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیاء کے مُصوّر ہو۔ تمہاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں۔ البتہ انتخاب ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چنانچہ انوری۔ خاقانی۔ ظہیر فاریابی وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر آئے۔ باقی سب نکالے گئے۔ ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا۔ اُس میں سے آب حیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مگر کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانیں لہراتی نظر آتی تھیں۔ اس لئے اس پر بھی تکرار ہوئی۔ اُس نے کہا۔ کہ بادشاہوں کو خُدا نے دفع اعدا کے لئے تلوار دی ہے۔ مگر ملک مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگر چند بوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں۔ تو اعدائے بد نہاد ہمارے خون عزت

کے بہانے سے کب چوکیں - چنانچہ یہ عذر اُس کا قبول ہوا - یہ انوری تھا - جو باوجود گُل افشانی فصاحت کے بعض موقعہ پر اس قدر ہجو کرتا تھا - کہ کان اُس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے - خاقانی پر اس معاملے میں اُس کے اُستاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے - چونکہ اُس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی - اِس لئے وہ بھی اس کی کرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہو سکا - اِسی عرصہ میں چنگیز خاں آیا - اس کے لئے گو علماء - شعراء میں سے کوئی آگے نہ بڑھا بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے اُسے چشم حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا البتہ مؤرخوں کے گروہ نے بڑی دُھوم دھام کی - جب کسی کی زبان سے نسب نامہ کا لفظ نکلا تو اُس نے فوراً شمشیر جوہر دار سند کے طور پر پیش کی - جس کے اُوپر خونیں حرفوں سے رقم تھا " سلطنت میں میراث نہیں چلتی " علماء نے غل مچایا - کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بُو آئے وہ قصاب ہے - بادشاہوں میں اُس کا کام نہیں - شعراء نے کہا - کہ جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصوّرانِ تصانیف کی تحریر نے رنگ بقا نہ ڈالا ہو اُسے اس دربار میں نہ آنے دینگے - اس بات پر اس نے بھی تامّل کیا - اور اس بات پر متاسّف معلوم ہوتا تھا - اس وقت

ہاتف نے آواز دی۔ کہ اے چنگیز جس طرح ملک کو شمشیر کے جوش کو۔ قوم کے خون میں حرکت دی۔ اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اُٹھاتا۔ اتنے میں چند مورخ آگے بڑھے اور اُنھوں نے کچھ ورق دکھائے۔ کہ ان میں طورہ چنگیز خانی۔ یعنی اُس کے ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا۔ کہ اُسے دربار میں جگہ دو۔ مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو۔ اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو ۔

تھوڑی دیر گذری تھی۔ کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا۔ اُس کا نام ہلاکو خاں تھا۔ اُس کے لئے چند علماء نے بھی مورخوں کا ساتھ دیا؎ جس وقت اندر لائے۔ تو اس کے لئے بھی نکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا۔ مگر ایک مرد بزرگ نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا۔ جس کی وضع تشرّع عالموں کی تھی۔ لیکن کمر میں ایک طرف اصطرلاب دُوسری طرف کچھ اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں۔ بغل

؎ اس کے عہد میں علوم و فنون نے بڑی ترقّی کی تھی؛ خصوصاً علم ہیئت کی کتابیں اور رصد خانے کی تعمیر اس کی شاہد حال ہے۔ (نوٹ مُصنّف) ۔

ہیں فلسفہ اور حکمت کے چند اجزا تھے۔ ان کا نام محقق طوسی تھا۔ چنانچہ اُنہیں دیکھ کر کوئی نہ بول سکا۔ اُسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقق کو شیخ بُو علی سینا نے یہ کہہ کر پاس بٹھا لیا۔ کہ آپ نے میری کلاہِ شہرت میں بقائے دوام کے آب دار موتی ٹانکے۔ شکریہ ادا کرتا ہُوں +

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے موّرخوں نے اُس کو لانے کی التجا کی مگر وہ سب کو چھوڑ گیا اور اپنا آپ رہبر ہوا! کیونکہ وُہ موّرخ تھا۔ رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہُوا گیا اور ایک کُرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کہا کہ اے اہلِ تصنیف مَیں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوض جو خدا نے تمھیں قلم تحریر دیا ہے اُسے اظہار واقعیت اور خلائق کی عبرت اور نصیحت کے لیے کام میں لانا چاہیے یا اغراض نفسانی اور بد زبانی میں؟ تمام موّرخ ایک دُوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے کہ یہ کِس پر اِشارہ ہے؟ اُس وقت تیمور نے ابن عرب شاہ کے بُلانے کو ایماء فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا۔ چنانچہ اُس کا نام مصنّفوں کی فہرست سے نکالا گیا +

اِسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ. آزاد وضع۔ قطع تعلق کا لباس بر ہیں۔ خاکساری کا عمامہ سر پر۔ آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علماء اور صلحاء۔ مورخ اور شاعر سر جھکائے اُن کے ساتھ ہیں۔ وُہ دروازے پر آکر ٹھہرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی۔ تو کہا۔ کہ معذور رکھو۔ میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے۔ اور فی الحقیقت وُہ معذور رکھے جاتے اگر تمام اہل دربار کا شوق طلب اُن کے اِنکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے۔ ایک طلسمات کا شیشۂ مینائی اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اِس میں کِسی کو دُودھ۔ کسی کو شربت۔ کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کرسی نشین اُنہیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا۔ مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے۔ فقط اِس سِرے سے اُس سِرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ حافظ شیراز تھے۔ اور شیشۂ مینائی اُن کا دیوان تھا۔ جو فلک مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔ لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے۔ کہ دُور سے دیکھا۔ کہ بے شمار لڑکوں کا غول غُل مچاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں اُن کے ایک پیر مرد نورانی صُورت جِس کی سفید داڑھی میں شلفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے ایک طرّہ سر پر آویزاں

کیا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں گلدستہ۔ دُوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں اور پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے۔ مگر انہیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے۔ کیونکہ ایسا کون تھا جو شیخ سعدی اور اُن کی گلستان اور بوستان کو نہ جانتا تھا۔ اُنہوں نے کمرے میں قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا۔ اُس بیچارے کو ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھا۔ لیکن اَور کرُسی نشین کہ اکثر اُن سے واقف تھے۔ اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے وہ اُن کے مشتاق معلوم ہوئے۔ باوجود اس کے یہ منے۔ اور اتنا کہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے "دُنیا دیکھنے کے لئے ہے برتنے کے لئے نہیں"!

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اولوالعزم شخص آیا۔ جس کے چہرے سے خود سری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اِس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا۔ کہ اگر علماء کی نہیں تو مؤرّخوں کی کوئی سند ضرور چاہیئے ہے۔ بلکہ چغتائی خاندان کے مؤرّخ صاف اُس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اُس نے باوجود اس کے ایک کرُسی جس پر تیموری تمغہ

بھی لگا تھا۔ گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا۔ ہمایوں اُسے دیکھ کر شرمایا اور سر جُھکا لیا۔ مگر پھر تاج شاہی پر انداز کج کلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ بیٹے حق بے استقلال ہے۔ اُس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن کی اولاد میرے رستے پر قدم بہ قدم چلیں گے اور فخر کرینگے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا۔ جس کو انبوہ کثیر ایرانی۔ تورانی۔ ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں لیے آتا تھا۔ وُہ جس وقت آیا تو تمام اہل دربار کی نگاہیں اُس کی طرف اٹھیں اور رضامندیٔ عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے۔ کہ اکثر مسلمان اُس کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ہندو اسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا۔ نصاریٰ اس کو نصاریٰ سمجھتے تھے۔ مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت کے حروف لکھے تھے۔ اُس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی شکایت کر کے بدایونی پر خون کا دعوےٰ کیا۔ کہ اُس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا اور وہ فتح یاب ہوتا اگر چند منصف مصنفوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا۔ نیت کا پھل ہے۔

اِس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا۔ جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور نشے میں چوُر تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا۔ اُس کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اُسی کی زبان سے کہتا تھا؛ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزُ کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مُسکرائے مگر چونکہ دولت اُس کے ساتھ ساتھ تھی اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اِس لئے بدمست نہیں ہوتا تھا۔ جب نشے سے آنکھیں کھلتی تھیں۔ تو کچھ لِکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نورُ جہاں تھی *

شاہجہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہُت سے مؤرخ اُس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیئے تھے اور شاعر اُس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت اِن عمارتوں کے فوٹوگراف ہاتھ میں لیئے تھے۔ جو اُس کے نام کے کتابے دکھاتی اور سینکڑوں برس کی راہ تک اُس کا نام روشن دکھاتی تھیں؛ اُس کے آنے پر رضامندئ عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا مگر ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا چند بچوّں کو

ساتھ لئے آیا۔ کہ اپنی آنکھوں کا اور بچّوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہریار شاہجہاں کا چھوٹا بھائی تھا اور بچّے اُس کے بھتیجے تھے۔ اُس وقت وزیر اُس کا آگے بڑھا اور کہا کہ جو کچھ کیا گیا بد نیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا بلکہ خلق خدا کے امن اور مُلک کے انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہر حال اُسے دربار میں جگہ ملی۔ اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجے پر ممتاز ہوُا ۔

ایک تاجدار آیا۔ کہ جبّہ اور عمامہ سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا۔ مگر دوسرے ہاتھ میں جو فرد حساب تھی۔ اُس میں غرق تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی میزان کو پڑتالتا ہے۔ سب نے دیکھ کر کہا کہ اُنہیں خانقاہ میں لے جانا چاہیئے۔ اس دربار میں اس کا کچھ کام نہیں۔ لیکن ایک ولایتی کہ بظاہر مقطع اور معقول نظر آتا تھا وہ دونوں ہاتھ اُٹھا کر آگے بڑھا اور کہا کہ اے اراکین دربار ہمارے ظلِّ سبحانی نے اس کمبخت سلطنت کے لئے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہ کیا۔ اِس پر بھی تمہارے اعتراض اِس دربار میں جگہ نہ دینگے۔ یہ لطیفہ اُس نے اس مسخرے پن سے ادا کیا کہ سب مُسکرائے اور تجویز ہُوئی کہ تیموری خاندان

کے سب سے آخر میں انہیں بھی جگہ دے دو!
معلوم ہؤا۔ کہ وہ عالمگیر بادشاہ اور اُس کے ساتھ
نعمت خاں عالی تھا۔

اِس کے ساتھ ہی ایک بھنڈا جوان دکھنی وضع۔ جنگ کے ہتھیار لگائے۔ راجگی کے سکتے تمغے سے سجا ہؤا آیا۔ اُس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوئے۔ بلکہ عالمگیر کچھ کہا بھی چاہتا تھا مگر وہ کرسی کھینچ کر اُس کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بولا کہ صاحب ہمّت کو جگہ دو یا نہ دو وہ آپ جگہ پیدا کر لیتا ہے۔ یہ سیوا جی مرہٹہ تھا جس سے مرہٹہ خاندان کی بُنیاد ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دُور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اُس کے ایک بادشاہ آیا۔ اُس کی وضع ہندوستانی تھی۔ مصنّفوں اور مؤرّخوں میں سے کوئی اُس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے کہ کوئی اُن میں گویّا اور کوئی بھانڈ اور کوئی مسخرا نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آتے تھے کیونکہ ایک ولائتی دلاور اُن کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ علم کئے تھا۔ اُس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مخمل رومی کی کلاہ تھی۔ جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا۔ اور اسپ بخارائی زیرِ ران

تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمدؐ شاہ تھا۔ اُسے دیکھتے ہی سب نے کہا۔ کہ نکالو نکالو اِن کا یہاں کچھ کام نہیں۔ چنانچہ وہ فوراً دُوسرے دروازہ سے نکالے گئے۔ ولائیتی مذکور نادر شاہ تھا۔ جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کرکے تاج ہندوستان سر پر رکھا تھا۔ اُسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مِل گئی +

تھوڑی دیر ہُوئی تھی کہ ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوُا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا کوئی گُلدستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ اِنہیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کرکے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہُوئے۔ اِن میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا تو اُس کے مُنہ سے رنگا رنگ کے پھُول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھُولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے، کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ مگر پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اُٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سوؔدا تھے +

میرؔ بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ

دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے اور مُنہ پھیر لیتے تھے! درد کی آواز درد ناک دُنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کیے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم ذی وقار۔ متّقی پرہیزگار۔ دم میں داڑھی چٹ۔ بنگ کے سونٹا کندھے پر +

جرأت کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا، مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اُڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلم کاری اُس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش زبانی اُسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے جرأت کی طرف دیکھتے جاتے تھے +

ایک پیر مرد دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس جامہ پہنے۔ کھڑکی دار پگڑی باندھے۔ جریب ٹیکتے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور اُن کے دست و گریباں ہو جاتے لیکن چارہ خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے۔ بوڑھے میر امّن دہلوی۔ چار درویش کے مصنّف۔ اور بانکے صاحب

مرزا سرور فسانۂ عجائب والے تھے۔ ذوقؔ کے آنے پر لپٹ عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انہوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سوداؔ نے اٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالبؔ اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا۔ مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس اتنے میں آواز آئی کہ آزاد کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگہ میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔ مگر دہیں سے پھر کوئی بولا، کہ اُسے جن لوگوں میں بٹھا دوگے بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا کہ اُس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے اُسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے۔ اس مقدمہ پر قیل و قال شروع ہوئی میں چاہتا تھا۔ کہ نقاب چہرے سے اُلٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادئ ہمدم یعنے فرشتۂ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں

اس جھگڑے کو بھی بھول گیا اور خدا کا شکر کیا کہ
بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی - مردوں سے
زندوں میں تو آیا *

۶۔ آبِ حیات

(شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حاؔلی)

خواجہ الطاف حسین نام ۔ شمس العلما خطاب۔ حاؔلی تخلّص۔ ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے ۔ جب آپ نو برس کے ہوئے ۔ تو آپ کے والد خواجہ ایزد بخش نے اِنتقال کیا۔ چنانچہ آپ اپنے بہن بھائیوں کی سر پرستی میں تعلیم و تربیت پانے لگے ۔ ۱۸۵۶ء تک آپ علوم متداولہ حاصل کرتے رہے اس کے بعد سِلسِلۂ ملازمت میں داخل ہوئے ۔ اوّل ضِلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی ملی ۔ پھر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مصاحب بنے ۔ اس کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت کی ۔ اس عرصہ کے بعد اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرّس مقرر ہُوئے ۔ آخر ۱۸۸۷ء میں آسمان جاہ مدارالمہام حیدر آباد دکن نے از رہ قدر دانی آپ کا ۷۵ روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا ۔ جو کچھ عرصہ بعد ایک سو

روپیہ کر دیا گیا۔ ۱۹۰۴ء میں ادبی خدمات کے صلے میں آپ کو شمس العلماء کا خطاب سرکار انگریزی سے ملا۔ حیدر آباد سے وظیفہ مقرر ہو جانے کے بعد آپ نے ملازمت ترک کر دی تھی۔ چنانچہ عمر کے آخری سال پانی پت میں بسر ہوئے۔ جہاں آپ ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر ۱۹۱۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مندرجہ ذیل تصنیفات نثر آپ کی زندۂ جاوید ہیں :-

۱۔ **حیات سعدی**۔ شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی فارسی کے مشہور شاعر کی سوانح عمری اور ان کی نظم و نثر پر تبصرہ ہے۔

۲۔ **مقدمہ شعر و شاعری**۔ اردو شاعری پر ایک مبسوط مضمون ہے جو مقدمۂ دیوان حالی کے طور پر شائع ہوا۔

۳۔ **یادگار غالب**۔ اسد اللہ خاں غالب کی سوانح عمری اور اُن کی فارسی اور اُردو نظم و نثر پر تنقید ہے۔

۴۔ **حیات جاوید**۔ سر سید احمد خاں کی سوانح عمری ہے۔

اِن کے علاوہ متفرق مضامین ہیں۔ جو تہذیب الاخلاق وغیرہ رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ اور اب یہ مضامین کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں مکتوبات حالی بھی دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا حالی کی انشا پردازی مسلم ہے۔ آپ کی نثر میں سادگی۔ سلاست اور صفائی بدرجۂ احسن موجود ہے۔ تصنع اور

آورد کا کہیں نام نہیں ۔ بلکہ ہر مقام پر برجستگی اور بے تکلّفی پائی جاتی ہے ۔ جس مضمون کو ادا کرتے ہیں ۔ نہایت سادہ عبارت میں تحریر کرتے ہیں ۔ خیالات کا تسلسل اور زبان کی پختگی خود بخود دل پر اثر کرتی ہے ۔ زبان ٹکسالی ہے ۔ اور محاورات کا صحیح استعمال کرتے ہیں ۔ یہ سب باتیں ہیں لیکن عبارت میں شگفتگی نہیں ؂

ہم کو اس بے مثل کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہونے کا موقعہ اس وقت ملا ۔ جبکہ بہت سے اُردو اخباروں میں اُس پر ریویو لکھے جا چکے تھے ۔ اور اس کے مضامین اور ابواب کی تفصیل ان میں درج ہو چکی تھی ۔ پس اب کوئی محل اس بات کا باقی نہ تھا کہ اُس کی نسبت کچھ زیادہ لکھا جائے ۔ مگر جو خاص کیفیت اس کے دیکھنے سے ہمارے دل پر طاری ہوئی ہے ۔ ہم چاہتے ہیں ۔ کہ اس کو اپنے ہموطنوں پر بھی ظاہر کریں ؂

اِس تذکرے کو میں نے اوّل سے آخر تک دیکھا ۔ حق یہ ہے ۔ کہ یہ اُردو زبان کا پہلا تذکرہ ہے ۔ جس میں تذکرہ نویسی کے فرائض ادا کئے گئے ہیں ۔ ہمارے تذکرہ نگاروں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے ۔ کہ شعراء کے نہایت ضروری حالات کے تجسس میں بھی کبھی

کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں تک کے تاریخ ولادت۔ تاریخ وفات۔ مولد۔ مسکن۔ قوم۔ خاندان۔ تعلیم۔ مشورۂ سخن وغیرہ کا بھی بہت کم ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ تمام ہمّت اس بات میں صرف کی گئی ہے۔ کہ ان کا کلام جس قدر اپنے مذاق کے موافق پایا۔ لکھ دیا۔ اور اُن کی بے معنی اور لغو ستائش میں جس سے کلام اور صاحب کلام کی اصل حقیقت پر اور پردے پڑ جائیں۔ ورق کے ورق سیاہ کر دئے۔ مصنّف نے شعرا کے اُن ضروری حالات لکھنے پر ہی قناعت نہیں کی۔ بلکہ چند شخصوں کے سوا جن کے نشانِ قدم اگلے تذکرہ نویسوں کی بے پروائی سے کسی قدر محو ہو گئے ہیں۔ ہر شاعر کی سوانح عمری جہاں تک ممکن تھا۔ نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔ اُس نے ان کی تعریف میں وہ شاعرانہ مبالغے بھی نہیں کئے۔ جن کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ بلکہ خود اُن کے وقائع ایسے لکھے ہیں۔ جن سے اُن کی سیرت اور اخلاق پر استدلال ہو سکے۔ اُس نے اُن کے کلام اور شاعری پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ اور جا بجا اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ مگر ادب اور تہذیب کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور نہایت خوبی سے اس دشوار گذار مرحلے کو طے کیا ہے۔ وہ تاریخ اُردو کے مضمون میں پارسیوں۔ ہندوؤں اور بودھ مت

والوں کا نام ایسے ادب سے لیتا ہے۔ کہ ہمارے مسلمان بھائی اپنے مسلمان بھائیوں کا نام بھی ایسے ادب سے نہیں لے سکتے ؛

مُصنّف نے اِس تذکرہ کے اوّل میں دو مضمون زبان اُردو اور اردو نظم کی تاریخ پر لکھے ہیں۔ پہلا جو زبان اُردو سے متعلق ہے۔ اُس نے انگریزی مورخوں کی کتابوں سے نہایت کوشش کے ساتھ چھان بین کرکے مدد لی ہے۔ اور پچھلا بڑا حِصّہ جو کہ اُردو۔ بھاشا۔ عربی اور فارسی زبانوں سے متعلق ہے۔ وہ خاص مُصنّف کی بے انتہا اور بے بہا کوشش کا نتیجہ ہے۔ یہ تمام مضمون نہایت مفید اور بصیرت افزا اور زبان کی حقیقت کا آئینہ ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اگر مُصنّف سے اس باب میں کوئی ضروری بات فروگذاشت ہو گئی ہو۔ تو اس پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو شخص سب سے اوّل کوئی تاریخی مضمون لکھتا ہے۔ اس کو ہزاروں پریشان باتیں فراہم کرنی پڑتی ہے۔ اور ممکن نہیں۔ کہ کوئی ضروری چیز فروگذاست نہ ہو جائے۔ لیکن ہم افسوس کے طور پر لکھتے ہیں۔ کہ اُردو زبان کی ترقی کے بیان میں پرچہ تہذیب الاخلاق کا کچھ ذکر نہیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے۔ تو اس پرچہ نے اردو زبان کو چند

روز میں اس درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ جو کم سے کم
پچاس برس کے بعد اس کو حاصل ہوتا۔ اردو لٹریچر
پر اس پرچہ کا بہت بڑا احسان ہے۔ مذہب۔ اخلاق
معاشرت اور تمدن پر جو اعلیٰ درجہ کے مضامین اس
پرچہ میں لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دیا ہے
کہ اردو زبان کسی مطلب کے ادا کرنے سے قاصر نہیں
ہے۔ بلند خیالات کو سیدھے سادے لفظوں میں موثر
طور پر بیان کرنا اسی پرچہ نے لوگوں کو سکھایا ہے۔
اور اس فخر کا وہ ہمیشہ مستحق سمجھا جائے گا*

نظم اُردو کی تاریخ کا مضمون بھی جس کو پہلے مضمون
کا ضمیمہ کہنا چاہیئے۔ نہایت عمدہ ہے۔ اس کی نسبت
بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس میں نیچرل شاعری کا ذکر
جس کی بنیاد خود مصنّف نے انجمن پنجاب میں ڈالی
تھی۔ قلم انداز کیا گیا ہے۔ لیکن اس باب میں مُصنّف
کی طرف سے یہ عذر ہو سکتا ہے۔ کہ اس طرز کی شاعری
ابھی ایسی حالت میں ہے۔ کہ اس کا عدم اور وجود برابر
ہے۔ دوسرے جس چیز کی ہدایت خود مُصنّف سے
ہوئی ہے۔ اس کا جتانا مُصنّف کے معاصرین کا حق
ہے۔ نہ کہ خود مُصنّف کا۔ اس مضمون کے آخر میں
مصنّف نے میر انیس اور مرزا دبیر کو خاتمۂ شعرائے اُردو
لکھا ہے۔ یہ اس نے ایک نہایت انصاف کی بات

لکھی ہے۔ بلکہ میر انیس کا رُتبہ ہمارے نزدیک اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ ہماری رائے میں اُردو شاعری کا پورا پُورا اطلاق اگر ہو سکتا ہے۔ تو میر انیس ہی پر ہو سکتا ہے۔ میر انیس پر نہ صرف اہل لکھنؤ بلکہ اُن سے زیادہ اہل دہلی کو فخر کرنا چاہیے۔ کیونکہ اُن کے بزرگ اسی معدن کے جواہر تھے۔ یہ مثل کہ "بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گوّیا مرثیہ خواں" شاید اس زمانے میں مشہور ہوئی ہوگی۔ جبکہ مرثیہ گوئی کا آغاز تھا۔ اور غزل اور مثنوی معراج کمال کو پہنچ چکی تھیں۔ جیسے ہماری قوم میں اب سے بیس برس پہلے علوم قدیمہ کے سامنے علوم جدیدہ ہیچ و پوچ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اب روز بروز خیالات دگرگوں ہوتے جاتے ہیں۔ نظم اُردو میں نیچرل شاعری کا اگر پتہ ملتا ہے۔ تو میر انیس ہی کے کلام میں ملتا ہے۔ اِس کے بعد مُصنّف نے وؔلی سے لے کر غالبؔ تک شعرائے اُردو کے پانچ طبقے کئے ہیں اور ہر ایک طبقہ کے نامور اور مستند شاعر (جو کہ اس کے نزدیک مستند تھے) انتخاب کر لئے ہیں۔ اگرچہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا حال قلم انداز کیا گیا ہے۔ جو اپنے طبقہ میں مستند سمجھا جاتا تھا۔ جیسے طبقۂ پنجم میں مومن خاں مومنؔ یا میر نظام الدین خاں ممنونؔ۔ لیکن اس کا یہ عذر ہو سکتا

ہے۔ کہ مصنّف نے کہیں یہ دعوےٰ نہیں کیا۔ کہ کسی دَور کا کوئی شاعر فرو گذاشت نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ اُس نے ہر دَور میں سے چند شاعر بطور نمونہ کے انتخاب کر لئے ہیں۔ اور اس سے ان تغیرات کا دکھانا منظور ہے۔ جو ہر ایک دورہ میں زبان اُردو پر واقع ہوئے ہیں۔ البتہ اگر مصنّف تمام شعرائے اُردو کا حال بالاستیعاب لکھتا۔ تو چند نامی شاعروں کا ذکر نہ کرنا محل اعتراض تھا +

شعرا کے ذکر میں مصنّف نے اس بات کا التزام کیا ہے۔ کہ ابتدا سے آخر تک ہر ایک دَورہ میں جو جو الفاظ متروک اور اُن کی جگہ جو جو الفاظ مستعمل ہوتے گئے۔ وہ بھی بوجہ استیفا ذکر کیے جائیں۔ اور شہادت کے لئے جا بجا ہر ایک دَورہ کے شعراء کا کلام نقل کیا جائے۔ یہ کوشش نہایت تحسین و آفرین کے لائق ہے۔ اور ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ کہ اس میں کس قدر دِقّت اُٹھانی پڑی ہوگی۔ پھر جہاں جہاں معاصرین کو ایک دوسرے سے توارد ہؤا ہے۔ وہ اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ تاکہ معلوم ہو۔ کہ ہر ایک کا طرز بیان ایک ہی مطلب کے ادا کرنے میں کیسا تھا؛

اُس نے اور تذکرہ نویسوں کی طرح غزلوں کا انتخاب نہیں کیا۔ بلکہ ہر ایک شاعر کی سالم غزلیں لکھ دی

ہیں ۔ تاکہ ناظرین اُس کے عام خیالات کا اندازہ کر سکیں ۔حقیقت میں یہ بات ٹھیک نہیں تھی۔کہ تمام شعرا کے کلام میں سے صرف ایک خاص طرز اور خاص روش کے مضامین انتخاب کیئے جائیں ۔ اور ہر شخص کو مثلاً میر اور مرزا کا ہمپایہ ظاہر کیا جائے ۔ لیکن ہمارے نزدیک عام خیالات ظاہر کرنے کے ساتھ (جیسا کہ مصنّف نے کیا ہے) یہ بھی ضرور ہے .کہ ہر ایک شاعر کے اعلیٰ درجے کے خیالات اور اچھوتے مضامین بھی دکھائے جائیں ۔ تاکہ اس کا مبلغ فکر اور رسائیٔ طبیعت کا منتہا معلوم ہو ۔ اور اس کے پر کن اور پست خیالات بھی بطور نمونہ کے ظاہر کیئے جائیں تاکہ اس کی طبیعت کا اتار چڑھاؤ کا حال اچھی طرح خاطر نشین ہو جائے ؛

بظاہر اس تمام تذکرہ میں تیئیس ۲۳ شاعروں کا حال قلمبند اور ان کا کلام نقل کیا گیا ہے ۔ لیکن تراجم شعرا کے ضمن میں جا بجا اُن کے معاصرین اور اُن کے ہم صحبتوں کا ذکر بھی کیا ہے ۔ اور ہر موقعہ پر بہت دلچسپ نقلیں اور لطیفے ایزاد کیئے ہیں ۔ اور تمام حالات کے فراہم کرنے میں جو محنت اور جانکاہی مصنّف نے کی ہے ۔ اس کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ابتدائے سنِ تمیز سے ایک ایسی جامع کتاب

لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا۔ اور وقتاً فوقتاً جہاں جو سرمایہ ملا۔ اس کو احتیاط کے ساتھ ضبط کیا ہوگا۔ ورنہ ایسے تفصیلی حالات جو کتابوں میں درج نہ ہوئے ہوں۔ اور صرف افواہِ خلائق پہ جاری ہوں۔ کسی طرح اِس ترتیب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ بہادر شاہ اوّل کے عہد سے لے کر بہادر شاہ ثانی کے اخیر وقت تک۔ کہ سلطنت مغلیہ کے تنزل کا زمانہ ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس ہوتے ہیں۔ اس عبرت انگیز زمانہ کے ایک خاص عالم کی تصویر جیسی اس تذکرہ میں نظر آتی ہے۔ صفحاتِ تاریخ اس سے معرّا ہیں۔ ان حالات کو زیادہ تر دِلی سے اور اُس سے کسی قدر کم لکھنؤ سے تعلق ہے۔ اکثر مقامات پر ان حالات کو پڑھ کر بے اختیار جی بھر آتا ہے۔ اور زمانہ گذشتہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اِس کِتاب کو مورخانہ نگاہ سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس طرح قومی ترّقی کا ابتدائی ہنگامہ قابل دید ہوتا ہے۔ اِسی طرح قومی تنزل کا ابتدائی تماشا دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ عالی خاندان مٹتے ہیں اور پست بلند ہوتے ہیں۔ امیر زادے منصب اور خدمت سے مایوس ہو کر پیشہ یا مزدوری اختیار کرتے ہیں۔ بعضوں کا دل دُنیا سے سرد ہو جاتا ہے۔ اور وہ لباس فقر پہن کر کوئی تکیہ آباد کرتے ہیں۔ جن

فلک زدہ خاندانوں کو تلاش معاش میں رئیسوں اور دولتمندوں کے دروازے جھانکنے پڑتے ہیں۔ وہ عجب کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ضرورت اور فلاکت یہ کہتی ہے کہ پیٹ کے لئے تمام مکروہات کو گوارا کیجیے۔ مگر خاندانی غیرت جو ابھی طبیعتوں سے بالکل نیست و نابود نہیں ہوئی۔ ناگوار باتوں پر مائل نہیں کرنے دیتی اگر کہیں مقسوم سے قدم جم بھی جاتے ہیں تو اس کو قیام نہیں ہوتا۔ جہاں کوئی بات طبیعت کے خلاف دیکھتے ہیں فوراً بگڑ جاتے ہیں۔ اور پھر اُدھر رُخ نہیں کرتے۔ خاندان تباہ ہو چکے ہیں۔ مگر خاندانی افتخار ایک ایک کے دماغ میں بھرا ہوا ہے۔ شرفا کے قافلے جوق جوق دہلی سے لکھنؤ کو چلے جاتے ہیں۔ جن کے باپ دادا دربار شاہی کے رُکن رکین تھے۔ اُن کی اولاد بادل شاہ اور شاہ تسلیم کے تکیوں میں دُھونی رمائے بیٹھی ہے۔ جو عالیشان محلوں میں رہتے تھے۔ وہ درختوں کے سایہ میں پڑے اینڈ رہے ہیں جن لوگوں کا استقلال مہمات ملکی میں صرف ہوتا تھا اُن کی نسلوں کا استقلال اب خالی پھیکی وضع داریوں میں صرف ہوتا ہے۔ میر صاحب باایںہمہ تقدس بی نورن کی چوکھٹ کو ایک دفعہ روز سلام کر آتے ہیں شاہ صاحب کا تکیہ ہے۔ اور ہر روز سہ پہر کو تشریف

زادوں کا جمگھٹا ہے۔ امرا کی سفلہ مزاجی سے اہل کمال کو مسخرگی اختیار کرنی پڑی ہے۔ وہ اپنا تمام علم و فضل اور ذہن وجودت اسی میں صرف کرتے ہیں! اسی قسم کے صدہا واقعات ہیں۔ جن کو اس کتاب میں دیکھ کر بے انتہا عبرت ہوتی ہے۔ اور نیرنگیٔ روزگار کا ایک طرفہ تماشا نظر آتا ہے +

اگرچہ مصنّف نے اپنی کتاب میں کہیں اس بات کی تصریح نہیں کی۔ کہ اردو شاعری نے ہماری معاشرت ہمارے اخلاق۔ ہمارے خیالات پر کیا اثر کیا۔ لیکن اُس نے شعراء کا حال ایسا واشگاف لکھا ہے۔ کہ ہر صاحب رائے اس کو دیکھ کر اس باب میں اپنی رائے قائم کر سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُردو شاعری کی رفتار سرے ہی سے ایسی بے اصولی تھی۔ کہ وہ جس قدر آگے بڑھتی تھی۔ اسی قدر منزلِ مقصود سے دُور ہوتی جاتی تھی۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے۔ کہ اُردو شاعری کا آغاز اور سلطنت مغلیہ کا زوال ایک ہی وقت سے شروع ہوتا ہے۔ گویا اس کا بیج ایسی زمین میں بویا گیا تھا۔ جس میں زراعت کی قابلیت نہیں رہی تھی۔ شاعری کی اصلی ترقّی کا مدار ملک کی عام شائستگی اور تعلیم پر ہے۔ کیونکہ شعراء کو جس قدر شائستہ اور نکتہ فہم مخاطب میسر آتے ہیں۔ اُسی قدر اُن کے

خیالات شائستہ اور معقول ہوتے جاتے ہیں۔ اِسی بنا پر زمانہ کو عربی میں "اوصحح المؤدبلین" اور انگریزی میں "گریٹ ریفارمر" کہا گیا ہے۔ دُوسری چیز جو شاعری کو شگفتہ اور بارور کرتی ہے۔ وہ قومی سلطنت ہے۔ جس مُلک میں یہ دونوں صورتیں نہیں ہوتیں۔ تو شاعری کی اصلی ترقی ناممکن ہوتی ہے۔ مگر شخصی سلطنت سے بھی اس کو بہت کچھ مدد پہنچتی ہے۔ شعرا کو ایک خاص جماعت کے مذاق کے موافق جو کہ دربار شاہی کے رکن رکین اور اپنے زمانے کے علم و فضل و لیاقت میں سب سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اپنے خیالات کی تہذیب اور اصلاح کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اکبری دَورہ کی شاعری اس کی مصداق ہے۔ افسوس ہے۔ کہ اُردو شاعری نے اُس وقت جنم لیا۔ جبکہ اس کا کوئی مربی اور سرپرست نظر نہ آتا تھا۔ اور وہ دربار جو اُردو زبان کا ملجا و ماویٰ تھا۔ برخاست ہو چکا تھا۔ عام شائستگی و تعلیم تو مُلک میں پہلے ہی سے نہ تھی۔ امرا میں بہت سے بگڑ چکے تھے۔ اور جو کچھ باقی تھے۔ اُن کے مذاق افراطِ عیش و عشرت کے سبب فاسد ہو گئے تھے۔ خواص کا گروہ جس سے اہل علم و فضل کی جماعت مراد ہیں۔ اپنی بے اقتداری سے اس قابل نہ تھا۔ کہ شاعری کی بنیاد محض اُن کے مذاق پر رکھی

جاتی۔ غرض کوئی چیز ایسی نہ تھی۔ جو شعرا کے خیالات کو تہذیب و شائستگی کی طرف کھینچتی۔ بلکہ دائیں بائیں تمام اسباب ایسے جمع تھے۔ جو شاعروں کو بھاٹ اور مسخرہ بنانے والے یا مرض مالیخولیا میں مبتلا کرنے والے یا باہمی رشک و حسد کے باعث تھے۔ شعرا کو جن امیروں کے ہاں تعلق ہوتا تھا۔ وہ یا تو علم و فضل یا مذاقِ سخن سے عاری یا عیش و نشاط میں منہمک ہوتے تھے اور اس لئے ان کو سنجیدہ خیالات کبھی پسند نہ آتے تھے۔ بلکہ ہنسی اور چہل کی باتوں پر ہر طرف سے قرار واقعی داد ملتی تھی۔ ایسا ہی حال مشاعروں کا تھا۔ کہ وہاں بھی فحش اور بے حیائی یا کسی کی ہجو پر جس قدر تحسین و آفرین کا غل ہوتا تھا۔ اس کا عشر عشیر بھی ایک متین اور سنجیدہ کلام پر نہ ہوتا تھا۔ پھر چونکہ شعراء کے قدر دانوں کا قحط تھا۔ اگر کسی کو قسمت سے کوئی ٹھکانا مل جاتا تھا۔ تو وہ اس کو فوزِ عظیم جانتا۔ اور دوسرے شاعر کا وہاں رنگ نہ جمنے دیتا تھا۔ اسی بنا پر شاعروں میں باہم چشمکیں رہتی تھیں۔ بھرے مشاعروں میں ایک دوسرے پر اعتراض کرتا تھا۔ ایک دوسرے کی ہجو پڑھتا تھا۔ ایک دوسرے کی داد نہ دیتا تھا۔ شاگردوں کو حکم تھا۔ کہ بھری محفلوں میں حریفوں پر چوٹیں کرو قہقہے

لگاؤ - اور موقعہ نہ ملے - تو رمز و کنایہ میں خاکہ اُڑاؤ-
یہ بلا اس قدر پھیلی تھی - کہ ایک شاعر دوسرے شاعر
کا سوانگ بنا کر سر بازار نکلتا تھا - جہاں اُس کے
ننگ و ناموس کی بے حرمتی کی جاتی تھی - اُس کی
ہجو کے اشعار ڈنڈوں پر گائے جاتے تھے - شعرا کے
باہم رشک و حسد کا یہ حال تھا - کہ جس شاگرد کو
ہونہار جانتے تھے - اور خاص و عام کو اُس کی طرف
مائل دیکھتے تھے - اُس کے بتانے میں دریغ کرتے
تھے - اور اُس کو غلط اصلاحیں دے کر سر مشاعرہ
ذلیل کرنا چاہتے تھے - چند شاعر جو اعلیٰ درجے کے
قانع - مستغنی اور خود دار تھے - اور سنجیدگی جن کی
جبلّت میں پیدا کی گئی تھی - وہ بھی کوئی ایسی
انوکھی روش اختیار نہ کر سکتے تھے - جو سراسر مذاق
جمہور کے خلاف ہو - جیسے میر تقی علیہ الرحمتہ کہ
اُن کا ایک شعر پڑھ کر بے اختیار مُنہ سے درود
نکلتا ہے - اور دوسرا شعر پڑھ کر نہایت شرم آتی
ہے -

بہر حال اِس میں شک نہیں - کہ ہماری شاعری
بگڑی اور خوب بگڑی - اور اس کا اثر ہمارے اخلاق
پر ایسا ہی ہوا - جیسا ہوائے سمّی کا اثر صحت جسمانی
پر ہوتا ہے - اس مطلب کو زیادہ تفصیل کے ساتھ

بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ اب ہم مصنّف کی شکر گذاری پر اِس ہذیان سرائی کو ختم کرتے ہیں۔ جس نے اپنے بیش قیمت اوقات کا ایک بہت بڑا حصّہ صرف کرکے اہل وطن کے لئے ایک ایسی کتاب تیار کی ہے۔ جو زبان کے محقّقوں ــــ لئے ہادی اور رہنما ہے۔ سیر و اخبار کے شائقین کے واسطے ایک داستان عبرت انگیز ہے۔ ظرافت پسندوں اور نوجوانوں کے لئے سامان خندہ نشاط ہے۔ اور اصحاب رلائے کے لئے ایک مفصّل روداد ہے۔ جس میں اُردو شاعری کے فیصلے کے لئے کافی شہادتیں موجود ہیں۔ اگرچہ وہ وقت ابھی نہیں آیا۔ کہ شائستہ ملکوں کی طرح ہر نئی تصنیف اور تالیف پر ہمارے ہموطن بھی اس طرح گریں۔ جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی پر گرتا ہے۔ لیکن عُمدہ اور مفید تصانیف کا حق ہے۔ کہ اہلِ وطن دل و جان سے اُن پر متوجّہ ہوں۔ اور اُن کی قدر کریں۔ اور مصنّفوں کے شکر گذار ہوں +

ابن الوقت کی تقریر

(شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد - ایل ایل ڈی)

مولوی نذیر احمد ضلع بجنور میں ۶ دسمبر ۱۸۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد مولوی سعادت علی صاحب سے حاصل کی - پھر دہلی آئے اور ۱۸۴۵ء میں دہلی کالج میں داخل ہو گئے۔ مولوی صاحب کی عمر ۲۱ سال کی تھی۔ کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ چار برس بعد یعنی ۱۸۵۴ء میں آپ کی ملازمت کا سلسلہ شروع ہُوا +

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد آپ ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر الٰہ آباد پہنچے۔ وہاں آپ نے انگریزی زبان سیکھی۔ اسی زمانے میں گورنمنٹ تعزیرات ہند کا ترجمہ کرانا چاہتی تھی۔ چنانچہ یہ کام آپ کے سپرد ہُوا۔ آپ نے اس کام کو اس خوبی سے کیا کہ سر ولیم میور نے خوش ہو کر آپ کو کانپور کا تحصیلدار کر دیا اور پھر ضابطہ فوجداری کا ترجمہ ختم کرنے پر یعنی ۱۸۶۲ء میں

ڈپٹی کلکٹر ہو گئے +

۱۸۷۷ء میں آپ ایک ممتاز عہدے پر فائز ہو کر حیدرآباد دکن گئے جہاں آپ کی قابلیت کی قرار واقعی قدر کی گئی +

علمی خدمات کے صلے میں آپ نے گورنمنٹ سے متعدد انعام حاصل کئے۔ نقدی انعامات کے علاوہ ۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا اور ۱۹۰۲ء میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل۔ڈی کی ڈگری عطا کی۔ آخر ۱۹۱۲ء میں اس زبردست انشا پرداز اور محسن زبان اُردو نے وفات پائی +

قانونی اور مذہبی تراجم و تصانیف کے علاوہ مندرجہ ذیل ناول آپ کے چکیدۂ قلم ہیں :-

۱۔ مراۃ العروس ۲۔ بنات النعش ۳۔ توبۃ نصوح ۴۔ ابن الوقت ۵۔ محصنات ۶۔ ایامیٰ ۷۔ رویائے صادقہ +

مولانا نذیر احمد کی زبان خاص دہلی کی ٹکسالی زبان ہے نہایت صاف، سادہ، رواں اور شیریں۔ تحریر میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن ہے۔ برجستہ محاورات کا اتنا شوق ہے کہ کوئی بات لُطف محاورہ سے خالی نہیں ہوتی۔ کہیں کہیں سنجیدہ ظرافت سے بھی شگفتگی پیدا کر دیتے ہیں +

محاورات کا حد اعتدال سے بڑھا ہؤا شوق آپ کی عبارت میں کہیں کہیں خامی اور نقص بھی پیدا کر دیتا ہے بعض اوقات عوام کی زبان لکھ جاتے ہیں۔ محاورات کا بھی سبک اور عامیانہ استعمال کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی عربی کے

مغلق اور غیر مانوس نعت لے آتے ہیں۔ با ایں ہمہ آپ زبردست اِنشا پرداز ہیں اور آپ کا اسلوبِ بیان نہایت پُر لطف اور موثر ہے +

مولوی نذیر احمد پہلے انشاء پرداز ہیں جنہوں نے اُردو کو ناول سے رو شناس کیا۔ اگرچہ آپ کے ناول حقیقی معنوں میں ناول نہیں تاہم اُنہیں بجز ناول اور کسی نام سے موسوم کیا بھی نہیں جا سکتا۔ آپ کے ناولوں میں اخلاقی پہلو بہت روشن ہے +

[یہ مضمون یعنی "ابن الوقت کی تقریر" "ابن الوقت" سے لیا گیا ہے اور اس اقتباس کی اجازت جناب مولوی مُنذر احمد صاحب بی۔اے ایل ایل۔بی سے حاصل کر لی گئی ہے +]

صاحبو! مجھ کو اس طرح کے معزز جلسے میں پہلے پہل تقریر کرنے کا اتفاق ہوا ہے اور مجھ کو آپ صاحبوں کے روبرو بات کرنے کی عادت اور صلاحیت دونوں نہیں۔ مگر نوبل صاحب نے ایسی مہربانی کے ساتھ میری تقریب آپ صاحبوں سے کی ہے کہ اُن کی شکر گذاری کو میں اپنا فرض موقت خیال کرتا ہوں +

میں نے اپنے پندار میں کوئی کام ایسا نہیں کیا

جس کے واسطے نوبل صاحب یا گورنمنٹ میری احسان مند ہو۔ میں نے نوبل صاحب کو مُردوں کے انبار میں سے اٹھایا اور اپنے گھر لے جا کر رکھا۔ لیکن اگر مَیں ایسا نہ کرتا تو میں مسلمان بلکہ انسان نہ تھا۔ پس مَیں نے اپنا فرض مذہبی بلکہ فرض انسانیت ادا کیا۔ اور مَیں نہیں سمجھتا کہ مجھ کو کسی طرح کی خاص مدح کا استحقاق حاصل ہے۔ یہ نوبل صاحب کی ذاتی شرافت اور گورنمنٹ کی فیاضی ہے کہ نوبل صاحب میرا احسان مانتے ہیں اور گورنمنٹ نے کثیر المنافع زمینداری اور باوقعت بیش بہا ماہانے کی نوکری مجھ کو عطا فرمائی ٭

ابھی تک غدر سے پوری پوری نجات حاصل نہیں ہوئی۔ لیکن اُس کی جڑ کٹ گئی ہے اور شاخ و برگ کی اگر کوشش نہ بھی کی جائے تو آپ سے آپ خشک ہو کر اور گل سڑ کر خاک میں مل جائیں گے۔ دُنیا کا قاعدہ ہے کہ نتیجہ کے واقع ہونے کے بعد اُس کے اسباب کی جستجو کی جاتی ہے! لیکن مُبارک ہیں وہ لوگ جو وقوع نتیجہ سے پہلے اسباب پر نظر کرتے ہیں۔ ع :-

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

نیز اگر وہ موقع ہم سے فوت ہو گیا تاہم بعد الوقوع

اسباب غدر کا خیال کرنا اس وقت دلچسپ اور آئندہ مُفید ہوگا۔ اخبار والوں نے اس کی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہے۔ اور ہر شخص جو کچھ اُس کے مُنہ میں آتا ہے۔ کہتا ہے۔ لیکن اگر گورنمنٹ جس کو واقعی اسباب غدر کا جاننا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اخبار والوں کی رائے پر عمل کرے گی۔ اور اخبار والے تو آخر اِسی غرض سے خامہ فرسائی کر بھی رہے ہیں۔ تو میں گورنمنٹ سے اور آپ صاحبوں سے مُعافی مانگ کر یہ بات کہتا ہُوں۔ کہ گورنمنٹ دھوکا کھائے گی۔ اور گورنمنٹ کی خیر خواہی مجھ کو اس بات کے کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ کہ شاید وہ ویسی ہی ناواقف اور بے خبر گورنمنٹ رہے گی جیسی غدر سے پہلے تھی۔

سلطنت میں رعایا اور گورنمنٹ دونوں کی اغراض وابستۂ یک دگر ہیں۔ اگر ہندوستانیوں کو انگریزی سلطنت سے امن و آزادی کے گوناگوں فائدے پہنچے ہیں جو فی الواقع اُن کو کسی زمانے میں نصیب نہیں ہوئے تو اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ اِنگلستان اسی سلطنت کی بدولت مالا مال ہو گیا ہے اور اِسی سلطنت کے برتے پر اُس نے تمام یورپ کی سلطنتوں کی کنّی دبائی ہے۔ ممکن ہے۔ کہ بعض

احمق ہندوستانی اسی کو انگلستان کا بڑا مفاد سمجھتے ہیں کہ انگریز بڑی بڑی تنخواہیں پاتے ہیں - یہ تو اُن فائدوں کا پاسنگ بھی نہیں - بات یہ ہے - کہ انگلستان صناعی اور ہنر مندی کا گھر ہے - اور اِس کے تموّل کا بڑا ذریعہ بلکہ مَیں کہ سکتا ہوں - تنہا ذریعہ تجارت ہے - سو ہندوستان کی سلطنت نے انگلستان کی تجارت کو ہزار ہا گونہ تو اب بڑھا رکھا ہے - اور کوئی کہ نہیں سکتا - کہ اس میں کہاں تک افزائش ہوگی - پس اگر اغراض کا موازنہ کریں - تو میرے نزدیک اِنگلستان کی اغراض کا پلّہ جھکتا رہیگا - یہ سبب ہے - کہ انگریزوں کو غدر کا زیادہ فکر ہونا چاہیئے -

مَیں تو اس کو انگریزوں کی اقبال مندی سمجھتا ہوں کہ حسنِ اتفاق سے اس وقت کوئی معاصر سلطنت ہندوستان کی دعوےٰ دار نہیں ہُوئی - اور اہل ہند میں اس سرے سے اُس سِرے تک کسی فردِ بشر میں سلطنت کی صلاحیت نہ تھی - اور ہندوستان کی مختلف اقوام میں اتفاق کا رنگ پیدا ہونے نہیں پایا تھا - انگریزوں نے اِس مُلک کو بزورِ شمشیر فتح کیا - اور بزورِ شمشیر اس پر قابض رہے - اور بزورِ شمشیر غدر کو بھی فرو کر دیا - مگر زورِ شمشیر رعایا کے جسموں کو

مسخر کر سکتا ہے نہ دلوں کو۔ یہ مُلک صدہا بلکہ ہزارہا برس سے شخصی سلطنتوں کا محکوم رہا ہے۔ اور یہاں کی رعایا نے ابھی تک انگریزی سلطنت کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے۔ اور یہ لوگ حکام ضلع کو بادشاہ کا اوتار خیال کرتے ہیں۔ پس اس مُلک کے عہدیداران انگریزی کے ذمّے دوسرے فرائض خدمت کے علاوہ ایک بڑا ضروری فرض مزید یہ ہے کہ ہر وقت اپنے تیئں ملکہ کا قائم مقام سمجھ کر لوگوں کے ساتھ اُسی طرح کا برتاؤ کریں جو ملکہ کے لئے زیبا ہے ٭

اب آپ صاحبوں میں سے ہر شخص اپنے دِل میں خیال کر سکتا ہے۔ کہ اُس نے اِس فرض کو کہاں تک ادا کیا ہے۔ انگریز الا ماشاء اللہ اِس مُلک میں ایسا رُوکھا مزاج بنائے رکھتے ہیں اور ہندوستانیوں کو ایسی حقارت اور نفرت سے دیکھتے ہیں کہ کوئی اُن کے پاس نہیں پھٹکتا تاوقتیکہ اُس کو ضرورت مجبور نہ کرے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں میں محبّت اور اخلاص کا ہونا ایسا دشوار ہے۔ جیسے شیر اور بکری میں۔ مَیں ہندوستانیوں کے ڈیفنس میں ایک لفظ کہنا نہیں چاہتا اور اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ کوئی انگریز جنٹلمین اُن کی ملاقات سے کبھی محظوظ نہیں ہو سکتا۔

لیکن اگر بڑوں سے پالا پڑ جائے۔ تو تھوڑا بہت اپنی طبیعت پر بھی جبر کرنا چاہیئے۔ ع

چہ تواں کرد مرد ماں اینند

اور جو شخص اس تکلیف کا متحمل نہیں ہونا چاہتا۔ تو اس کو اُن بڑوں سے بھلائی کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیئے *

غدر کے بعد سے ہر انگریز کو یہ شکایت پیدا ہوئی ہے۔ کہ ہندوستان نے اِس کی مدد نہیں کی۔ لیکن ذرا گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھے۔ کہ وہ کِس احسان! کِس سلوک کِس مہربانی کے عوض میں اس مدد کا مستحق تھا۔ وہ شاید اپنا ایک حق بھی کسی ہندوستانی پر ثابت نہیں کر سکے گا۔ اس اصول منصفانہ کو پیش نظر رکھیں تو بغاوت کی لمبی فہرست صرف ایک فرد مختصر رہ جائے گی۔ اب رہ گئی بغاوت۔ بمقابلۂ سرکار سو میں آپ صاحبوں کی خدمت میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہندوستانیوں کے نزدیک سرکار کوئی چیز نہیں! احسان فراموشی انسان کی نیچر یعنی تقاضائے طبیعت ہے۔ غدر جس کا [illegible]ں نے اتنا بڑا بتنگڑ بنا رکھا ہے میرے نزدیک انسانی نیچر کے ظہور سے کچھ زیادہ نہ تھا۔ ہر چند انگریزی عملداری سے ہندوستانیوں کو بہت سے فائدے پہنچے تھے۔ مگر اُن کو واقعی یا

ادعائے واجب یا غیر واجب چند در چند شکایتیں بھی تھیں۔ پس اگر اُنھوں نے شکایتوں کے جوش میں فائدوں پر نظر نہ کی۔ تو اُس کو ضعف بشریت اور انسان کی نیچر کے نقصان کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

انگریزی اور ایشیائے حکومتوں کا طرز ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے۔ کہ ایک کو دُوسرے سے کچھ مناسبت نہیں۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس سے ہندوستانی خوگر تھے۔ اپنے ہموطنوں کی حکومت کے جن کے درباروں میں اُن کی رسائے بآسانی ہو سکتی تھی۔ مُلک کی تمام آمدنی بادشاہ کی خاص ملکیت ہوتی تھی۔ اور وہ اِس کو بلا مزاحمت جس طرح چاہتا تھا خرچ کرتا تھا۔ مگر اِس ملک کی ساری دولت ایشیائے حکومتوں میں سدا بیہودہ نمود و نمائش اور ممنوع عیاشی میں برباد ہوا کی۔ اور اس سے متمتع ہوتے رہے خوشامدی خود غرض۔ بہرکیف دولت کا دریا ایک رُخ کو بہتا اور ان لوگوں کو سیراب کرتا رہا جن کی قسمتوں میں اِس سے فائدہ اُٹھانا تھا۔

ہندوستانی عملداری جا کر انگریزی عملداری کا آنا اس سے تو کسی طرح کم نہیں۔ کہ وہ دریائے ذخائر ایک سمت کو بہتے بہتے لگا سمت مخالف میں دوسری

جگہ بھنے یعنی ایک ایسی سلطنت شروع ہوئی جس کی مثال اس مُلک میں نہ دید ہے نہ شنید ہے۔ خلق خدا کی، مُلک وکٹوریہ بادشاہ زادی کا، حُکم کمپنی بہادر کا۔ خلقت ایک اور اِکھٹے تین تین فرمانروا۔ اور تینوں نظر سے پوشیدہ۔ آپ صاحب یہاں کے لوگوں کی حیرت پر تعجب کریں گے۔ مگر اِس میں رتّی برابر مبالغہ نہیں ہے۔ انگریزی سلطنت رعایائے ہندوستان کے حق میں ایک پہیلی ہے۔ جس کو اکثر عوام الناس نہیں بُوجھ سکتے۔ تبدیل سلطنت یُوں بھی کچھ آسان بات نہیں۔ پھر ایسا تبدل کہ حاکم و محکوم میں کسی طرح کی مناسبت نہیں۔ نہ وطن ایک، نہ زبان ایک، نہ مذہب ایک۔ پس ہندوستانیوں کے حق میں سلطنت کیا بدلی گویا ساری خدائی بدل گئی۔ اگلے تمام ذریعے معطل۔ ساری لیاقتیں بیکار۔ کل تدبیریں بے اثر۔ شاہی متوسل اور متوسلوں کے متوسل کہ اُن کا مجموعہ بجائے خود ایک جم غفیر ہوگا۔ بے آسرے اور بے سہارے ہو کر بیٹھ رہے۔ اب ہر ایک مُنصف مزاج آدمی خیال کر سکتا ہے۔ کہ اِس گروہ کو انگریزی عمل داری سے ناخوش ہونے اور رہنے کی وجہ معقول تھی یا نہیں۔ پھر انگریزی عملداری اتنی پُرانی ہو گئی تھی۔ کہ جن لوگوں نے بادشاہی وقت دیکھے تھے۔ مر کھپ

چکے تھے۔ اور چاہیئے تھا۔ کہ اس زمانے کی باتیں بھی بھول بسر جاتیں۔ مگر ہم دیکھتے تھے۔ تو اُن کی یادگار ہر دم تازہ ہے۔ اور اس وجہ سے کہ اب بھی چھوٹی بڑی محکوم اور مختار بہتیری ہندوستانی ریاستیں جگہ جگہ موجود ہیں۔ اور اُن میں بلا کم و کاست ایشیائی حکومت کے نمونے باقی ہیں +

اگر سرکار انگریزی کو اپنی رعایا کا خوش دل رکھنا منظور ہے۔ تو چار دانگ ہندوستان میں اِس سرے سے اُس سرے تک ایک طرح کا انتظام ہونا چاہیئے۔ مجھ کو بیرونِ شہر کسی ہندوستانی ریاست میں رہنے یا نوکری کرنے کا اِتفاق نہیں ہوا۔ مگر لوگوں کے کہنے سُننے سے۔ اخبار سے بعض ریاستوں کے عام حالات معلوم ہیں۔ اور دہلی کا قلعہ بھی بجائے خود چھوٹی سی ریاست تھی۔ اور میں پشتہا پشت سے اِسی شہر کا رہنے والا اور سرکار شاہی کا متوسل ہوں۔ اور شہر اور قلعہ دونوں کا کوئی حال مجھ سے مخفی نہیں۔ اتنا کہ سکتا ہوں کہ اہل شہر اور اہلِ قلعہ کی زندگی ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھی۔ کہ قلعہ ایک دوسری دُنیا معلوم ہوتا تھا۔ جب سلطنت میں غدر کی وجہ سے اتنا بڑا انقلاب ہوا۔ کہ ملکہ معظمہ نے زمام حکومت اپنے دست خاص میں لی۔ اور کمپنی کو کچھ تعلق نہ رہا تو میں اِس

کو ملک کے حق میں فال نیک سمجھتا ہوں اور مجھ کو پُورا بھروسا ہے کہ گورنمنٹ کے اِنتظامات میں یقیناً بڑی بڑی تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ پس اگر کوئی مجھ سے صلاح پوچھے۔ تو میں پہلے اسی بات کو بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کروں گا۔ کہ گورنمنٹ اپنے تعلقات اندرونی ایشیائی گورنمنٹوں کے ساتھ درست کرے +

یہ ہندوستانی ریاستیں جن کا مجموعہ۔ کیا رقبہ۔ کیا مردم شُماری۔ کیا محاصل۔ کسی اعتبار سے انگریزی سلطنت سے کم نہیں۔ باستثنائے معدودے چند اس قدر بیٹ بھر کر خراب ہو رہی ہیں۔ کہ اُن کی حالت نہ صرف انہی کے حق میں خطرناک ہے۔ بلکہ انگریزی طرز انتظام انگریزی رعایا سبھی کے حق میں۔ اور جب تک اِن ریاستوں کی پوُری پوُری اِصلاح نہ ہو۔ انگریزی گورنمنٹ کو کبھی اپنے انتظام کی طرف سے مطمئن نہیں ہونا چاہیئے۔ اِن میں سے ایک ایک ریاست اگر اِس کے اِنتظام میں فساد ہے۔ انگریزی گورنمنٹ کے حق میں بغلی گھونسا ہے فِساد عظیم سے میری مُراد یہی نہیں کہ رئیس اپنے تئیں سرکار انگریزی کا مدِّ مقابل سمجھتا ہو یا نافرمانی یا عدول حکم سے گورنمنٹ کا استخفاف کرتا ہو۔ میں اس بات کو مکرّر کہتا ہوں۔ کہ ہندوستانی رئیس ہندو ہو یا

مسلمان آرام طلب ہوگا۔ کاہل ہوگا۔ احمق ہوگا۔ عیاش ہوگا۔ غافل ہوگا۔ مسرف ہوگا۔ خرچ آمد سے فاضل ہوگا غرض اُس میں سب طرح کے جنون ہوں گے۔ مگر نہیں ہوگا تو ایک جنون بغاوت۔ سرکار نے اپنی فوجی طاقت کو ہندوستان میں خصوصاً بعد غدر ایسے زور سے ثابت کر دیا ہے۔ جیسے آگ نے جلانے کی خاصیت کو۔ پس ہندوستانی رئیسوں کی طرف ایسا خیال بالکل لغو اور محض بے اصل ہے۔ لیکن جس چیز سے گورنمنٹ انگریزی کو ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے میں ڈرانا چاہتا ہوں یہ ہے۔ کہ اکثر ہندوستانی رئیس اپنی چند در چند نالائقیوں اور گوناگوں بدکرداریوں کی وجہ سے ایسی خرابیاں کر رہے ہیں۔ کہ اوّل تو خود انہی کی رعایائے نامہذب و ناشائستہ سے انگریزی گورنمنٹ کو ہمیشہ خائف رہنا چاہیئے۔ دُوسرے اِن ریاستوں کے بُرے نمونے دیکھ کر رعایائے انگریزی کی طبیعتیں بگڑی چلی جاتی ہیں۔ جسد سلطنت میں یہ ریاستیں گویا برص کے چھپٹے ہیں۔ کیونکر اطمینان ہو سکتا ہے۔ کہ ان چھپٹوں کا فساد دوسرے اعضائے صحیح تک متعدی نہ ہوگا۔

اگر میری تقریر سے ایسا مستنبط ہوتا ہو۔ کہ مَیں ان ریاستوں کے ضبط کرنے کی رائے رکھتا ہوں۔ تو مجھ سے بڑھ کر قوم و ملک کا کوئی دشمن نہیں۔ لیکن

یہ میری رائے ضرور ہے۔ کہ ان ریاستوں کا نا منتظم حالتوں میں رہنے دینا ویسا ہی ظلم ہے جیسا اِن کا ضبط کرنا۔ جب انگریزی گورنمنٹ اپنے تئیں اِن شکمی گورنمنٹوں کا مربی اور حامی اور محافظ سمجھتی ہے۔ اور فی الواقع وہ ہے بھی تو اِن کی اصلاح کا فرض لازمی ہے لیکن انگریزی گورنمنٹ نے اِس فرض کے ادا کرنے میں کما حقہ اہتمام نہیں کیا۔ بے شبہ سرکار کی طرف سے ایجنٹ یا رزیڈنٹ کے نام سے ایک عہدہ دار ہر ایک ہندوستانی ریاست پر مسلط ہے۔ مگر اِس کو ریاست کے اندرونی انتظام میں حکماً کچھ مداخلت نہیں۔ وہ اتنی ہی بات کی نگرانی رکھتا ہے کہ ریاست میں سرکار انگریزی کا رعب و داب اچھی طرح قائم رہے۔ اور کوئی بدنظمی نہ ہو۔ اگر ایک باپ اولاد کے ساتھ وہ کرے۔ جو انگریزی گورنمنٹ نے ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ اب تک کیا ہے۔ تو ہم ایسے باپ کی مدح نہیں کر سکتے۔ جتنا اُس نے کیا اچھا کیا۔ مگر اس کو اس سے بہت زیادہ کرنا چاہیئے تھا۔ مہذّب دُنیا کی نظر میں انگریزی گورنمنٹ کبھی من الحیث المجموع منتظم نہیں سمجھی جائے گی تاوقتیکہ اس کی تمام شکمی گورنمنٹیں اس طرح منتظم نہ ہوں جیسے اس کا اپنا علاقہ۔ انگریزی سلطنت کبھی بیرونی دشمنوں کے خدشے سے خالی

نہیں رہتی - اور اس کو خالی رہنا چاہیئے بھی نہیں ؛ لیکن تعجّب کی بات ہے - کہ میں اس کو قسمی ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے کبھی خدشہ کرتے ہوئے نہیں پاتا - حالانکہ اگر یہ ریاستیں نامنتظم رہیں - جیسی کہ اب ہیں - تو یہ اندرونی دشمن بیرونی دشمن سے بہُت زیادہ خطرناک ہیں *


اب میں آپ صاحبوں کو ایک دوسرے مطلب کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں - دُنیا کی قوموں میں نفرت اور عداوت کی بہُت سی وجوہ ہو سکتی ہیں - مگر سب سے زیادہ شدید اختلاف مذہب ہے - خصوصاً ہندوستانیوں کے نزدیک - ہندو اپنے مذہب کے ایسے سخت متعصب ہیں - کہ کسی طرح دوسرے مذہب کے لوگوں سے ملنا نہیں چاہتے - جو لوگ دُوسری قوم کا چھُوا پانی نہ پی سکیں - اُن سے دوستی اور اتحاد کی کیا توقع ہو سکتی ہے ؟ ہندوستان کے باشندوں میں انگریزوں کے ساتھ ارتباط اور اختلاط کرنے والے کچھُ لوگ اگر ہیں - تو مُسلمان ہیں - کیونکہ سچّا مذہب اسلام ایسے تعصبات سے بالکل بری ہے - صرف یہی نہیں - کہ مسلمان کی مقدّس آسمانی کتاب یعنی قرآن اس سے ساکت ہے - بلکہ اِس میں نصاریٰ کے ساتھ مواکلت اور مناکحت دونوں کی صاف و صریح اجازت موجود ہے - اور میں

نہیں سمجھتا۔ کہ مواکلت اور مناکحت سے بڑھ کر دوستی پیدا کرنے کا کوئی اور بھی ذریعہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی حالت میں ہم اس بات کا کافی ثبوت رکھتے ہیں۔ کہ مذہب کہاں تک رسم و رواج سے متاثر ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں ایک مدت سے ہندوستانی ملے جلے رہتے آئے ہیں۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں قوموں نے ایک دوسرے سے بہت سی باتیں اخذ کر رکھی ہیں۔ اور بڑی خوشی کی بات ہے۔ کہ دونوں میں اختلاف مذہب اور خاص کر مذہب ہنود کے روکھے پن کی وجہ سے جو منافرت ہونی چاہئے تھی۔ مدت کی یکجائی نے اُس کو بہت کم کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی دیکھا دیکھی ہندو دھوتیاں اور کھڑاویں چھوڑ کر پاجامے اور جوتیاں پہننے۔ اپنی عورتوں کو پردے میں بٹھانے اور مسلمانوں کے علوم پڑھنے لگے۔ ہزارہا ہنود محرّم میں جو مسلمانوں کا مشہور مذہبی تیوہار ہے۔ تعزیہ داری کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی طرح مسلمان بزرگوں کی قبروں کی تعظیم کرتے ہیں۔ اُن سے منتیں مانتے ہیں۔ کہ یہ ایک قسم کی پرستش ہے۔ اِسی طرح مسلمان ہندوؤں کی تقلید سے کھانے پینے کا پرہیز کرنے لگے ہیں۔ اپنی بیوہ عورتوں کا نکاح نہیں کرتے۔ اکثر نجوم کے معتقد ہیں۔ شادی بیاہ میں بہت سی رسمیں ہیں

جن کی مذہب میں کچھ اصل نہیں۔ ہندوؤں سے لی گئی ہیں۔ غرض ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاط کا یہ نتیجہ ضرور ہوا ہے۔ کہ ایک کو دوسرے سے وحشت باقی نہیں رہی۔ لیکن یہ کیفیت کہیں صدہا سال میں جا کر پیدا ہوئی ہے۔ اور پھر بھی میں اس کو اتحاد کا درجہ نہیں سمجھتا۔ دونوں کے دل بدستور ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ آج کوئی بھڑکانے والا کھڑا ہو۔ تو مسلمان کے نزدیک ہندو ویسے ہی کافر اور مشرک ہیں۔ اور ہندوؤں کی نظر میں مسلمان ویسے ہی ہتیارے۔ بھرشٹ۔ اور یہ نا اتفاقی انگریزی گورنمنٹ کے حق میں ایک فال مبارک اور شگون نیک ہے۔ مگر وہیں تک کہ باہم رعایا میں ہو ؂

اب دیکھنا چاہیئے۔ کہ سرکار نے کہاں تک مذہبی نا رضامندی کو اپنے مقابلے میں پیدا ہونے نہیں دیا۔ سو لوگوں میں تو یہی بات مشہور ہے۔ کہ یہ تمام فساد چربی کے کارتوسوں کا تھا۔ مگر میرے نزدیک یہ ایک نہایت خفیف رائے ہے۔ عوام کو ایسا مغالطہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک ہر انگریز سرکار ہے۔ اگرچہ وہ امریکہ کے کسی مشن کا پادری۔ سوداگر یا سیاح یا شکاری ہی کیوں نہ ہو۔ مگر جو لوگ انگریزی گورنمنٹ کے حالات سے کسی قدر بھی واقف ہیں۔

مذہبی ادا کرنے سے نہیں روکا۔ یا کسی کو زبردستی یا کسی طرح کا لالچ دِکھا کر عیسائی کرنا نہیں چاہا۔ تو یہ بالکل صحیح ہے۔ اور اس سے کسی کو اِنکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن مذہب کا اور خاص کر ہندوؤں کے مذہب کا بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ اِن کا مذہب چھوئی موئی سے بڑھ کر نازک ہے۔ اس کا مدار نہ صرف دل کے خیالات پر ہے۔ کہ ان پر کسی کا دست رس نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ایک ہندو بے قصد و بے ارادہ کھانے سے پینے سے چھونے سے بے دین ہو جا سکتا ہے۔ اور ان کے مذہب کا یہی ضعف دیکھ کر بعض مسلمان بادشاہوں کو موقع ملا۔ کہ ہزارہا ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کر ڈالا۔ غرض مسلمانوں کی مدارات دیکھ کر ہندو پہلے سے سہمے ہوئے تھے اب جو آئے انگریز تو انہوں نے دیکھا۔ کہ یہ مسلمانوں سے بھی چند قدم آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ یعنی جن چیزوں سے مسلمانوں کو پرہیز ہے۔ یہ ان کو بھی نہیں چھوڑتے۔ مذہب کو پھیلانے میں سرگرمی اس درجہ کی ہے۔ کہ گلی گلی پادری وعظ کہتے۔ مذہبی کتابیں مُفت بانٹتے پھرتے ہیں۔ چمار ہو۔ بھنگی ہو۔ اِن کو اپنی ذات میں مِلا لینے سے انکار نہیں۔ یوں ہندوؤں کے دِلوں میں از خود سرکار انگریزی کی طرف سے



مذہبی بد گمانی پیدا ہوئی +
بد گمانی کی مثال اُس درخت کی سی ہے۔ کہ کائی کی طرح ذرا سا آسرا پاکر جم کھڑا ہوتا ہے۔ اور کانس کی مانند جلانے سے لہلہاتا اور کاٹنے سے بڑھتا ہے۔ بدگمان آدمی کے ساتھ کتنا ہی سلوک۔ کیسی ہی بھلائی کرو۔ وہ ہمیشہ اُس کا بُرا ہی پہلو سوچا کرتا ہے۔ سرکاری تعلیم سے شُکر گذاری اور احسان مندی کے عوض اُلٹی مذہبی بد گمانی کو ترّقی ہوئی۔ لوگوں نے سمجھا۔ کہ انگریز احمق اور عقل سے خارج تو ہیں نہیں کہ کُھلم کُھلا زور ظلم کر کے اپنے کو بدنام اور رُسوا کر لیں۔ یہ ہیں میٹھی چھری۔ زہر کی بجھی۔ سر سہلائیں بھیجا کھائیں۔ دیکھو تو لوگوں کو کرسٹان بنانے کی کیا تدبیر نکالی ہے۔ ع :-

گُڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو

پھر اس بدگمانی پر طرّہ یہ کہ انگریزی خوانوں کو جو دیکھا تو عقیدے کے متزلزل۔ مذہب سے برگشتہ۔ اب وہ بدگمانی بدگمانی نہ رہی۔ بلکہ مرتبہ یقین تک جا پہنچی یہ باتیں جو میں آپ صاحبوں کے روبرو بیان کر رہا ہوں۔ اگرچہ فرداً فرداً بعض اِن میں کی آپ صاحبوں کی نظر میں بے وقعت بھی ہوں۔ مگر جب آپ سب کو جمع کر کے دیکھیں گے۔ تو آپ خود تسلیم

کریں گے۔ کہ مجموعی اسباب غدر و بغاوت کے لئے کافی تھے۔

ہندوستانیوں کے معابد کی تعظیم میں بھی انگریز ضرور کمی کرتے رہے ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد ایک مشہور عمارت ہے۔ ایسا کونسا مردہ دل انگریز ہوگا۔ کہ اس شہر میں کسی تقریب سے اس کا آنا ہو۔ اور وہ اِس مسجد کو دیکھنا نہ چاہے۔ یہاں تک تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ مگر جب مسلمان جوتیاں پہن کر مسجد میں جانا اپنے مذہب کی توہین کا موجب خیال کرتے ہیں۔ تو اگرچہ انگریزوں کے ہاں جوتی کا اتارنا تہذیب کے خلاف ہو۔ مگر اس میں کیا حرج ہے۔ کہ یا تو دروازہ ہیں سے دوربین لگا کر دیکھ لیا کریں یا جوتی اتار کر اندر چلیں پھریں۔ پھر یہ تو مسلمانوں کا حال ہے ہندو تو خوشی سے کسی حالت میں دوسرے مذہب والے کا اپنے معابد میں جانا جائز نہیں سمجھتے۔ مانا کہ عمدہ اور مشہور عمارتوں کا دیکھنا ایک طبعی شوق ہے۔ مگر شوق کے لئے دوسروں کی دِل آزاری کیا ضرور ہے۔ میں نے ایک مسلمان کے روبرو یہ عذر پیش کیا تھا۔ تو اُس نے کیا معقول جواب دیا۔ کہ کیوں صاحب آج کو تو عمارت کے دیکھنے کا شوق ہے۔ کل کو اگر کسی کو شوق اُبھرا۔ کہ دیکھیں ان کی عورتیں گھروں میں

کیونکر اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ تو کیا یہ لوگ ہمارے زنان خانوں میں گھُسیں گے؟
بات یہ ہے۔ کہ معاملہ پڑا ہے نادانوں کے ساتھ اگر اِن کی دلجوئی مدّ نظر ہو۔ تو ہزاروں تدبیریں ہیں۔ اور اگر سرے سے اُن کی کوئی حقیقت ہی نہ سمجھو۔ اور اُن کی رضامندی اور نارضامندی کا خیال ہی نہ کرو۔ جیسا کہ ہؤا۔ تو پھر غدر کی شکایت کیا۔ ہندوستانیوں کو حقیر سمجھنا اور اُن کی خوشی ناخوشی کی مطلق پروا نہ کرنا۔ یہ رنگ نہ صرف عہدہ داران انگریزی کی مدارات بلکہ خود گورنمنٹ کے تمام کاموں میں بھی جھلکتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ کی نیت بہ خیر ہے۔ اور رعایا کو ہر طرح سے آسودہ اور خوشحال رکھنا چاہتی ہے۔ مگر وہ دیکھتی ہے اپنے عہدہ داروں کی آنکھوں سے اور سُنتی ہے انہی عہدہ داروں کے کانوں سے جن کو رعایا کے ساتھ ارتباط اور اختلاط نہیں۔ پس رعایا کا دُکھ درد اُس کی حاجتیں اور ضرورتیں یعنی رعایا کا حال گورنمنٹ پر منکشف ہونے نہیں پاتا۔ میں اس بات کو مانتا ہوں۔ کہ سارے ہندوستان میں اِس سِرے سے اُس سِرے تک کوئی شخص ایسی معلومات اور لیاقت اور دیانت کا نظر نہیں آتا۔ کہ گورنمنٹ اُس کو رعیت کا وکیل سمجھ

کر اس سے مشورہ لے۔ اور اُس کی بات پر اعتماد کرے۔ جن لوگوں پر وجاہت اور تموّل کے اعتبار سے نظر پڑتی ہے۔ مثلاً ہندوستانی رئیس۔اکثر مٹی کے بھو ہے جن کو اتنا بھی معلوم نہیں۔کہ دو اور دو کَے ہوتے ہیں۔ پس اِن کا عدم اور وجود دونوں برابر اگر یہ لوگ گورنمنٹ انگریزی کو صلاح دینے کی قابلیت رکھتے ہوتے تو اپنی ہی ریاستوں کو نہ درست کر لیتے زیادہ نہیں۔ گنتی کے چند رئیس کچھ سمجھ دار بھی سنے جاتے ہیں۔ تو شاید کم فرصتی کا حیلہ کریں۔ در اصل بات یہ ہے۔ کہ اُن کو گورنمنٹ انگریزی کی مدد کا شوق کیوں ہونے لگا۔ اور مانا کہ شوق ہو بھی تو کونسل کے خرآنٹ تجربہ کار ممبروں کے ساتھ بحث کرنے کو بڑی لیاقت چاہیئے۔ پس اگر گورنمنٹ کی وہی مثل ہے۔ کہ طفل بہ مکتب نمی رود ولے برندش کسی ہندوستانی رئیس کو زبردستی لے جا کر کونسل میں بٹھا دے تو وہ بیچارہ سوائے اس کے کہ ٹکر ٹکر بیٹھا دیکھا کرے اور بے فائدہ لوگوں کی نظر میں خفیف ہو کیا کر سکے گا۔ کونسل کے ممبر ہیں۔ کہ باہم ردّ و قدح کر رہے ہیں۔ اور یہ سمجھتا بوجھتا خاک نہیں۔ اِسی سوچ میں ہے۔ کہ لاٹ صاحب کس کے پلّے پر ہیں۔ آخر جب ادائے رسم کے طور پر اس سے

پوچھنے کی نوبت آئی۔ تو لاٹ صاحب کی ہاں میں ہاں مِلا کر اپنا پیچھا چھڑا کر الگ ہو گیا*

اب رہ گئے وہ لوگ جنھوں نے انگریزی کالجوں میں تعلیم پائی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستانیوں میں سے کسی میں اگر مشیر گورنمنٹ ہونے کی صلاحیت ہے۔ تو ان میں ہے۔ انگریزی جانتے ہیں۔ اپنے مُلک کی حالت سے بھی واقف ہیں۔ خیالات بھی وسیع اور روشن ہیں۔ آزادی اور قومی ہمدردی کے بھی لمبے چوڑے دعوے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے۔ کہ انگریزی گورنمنٹ کی ماہیت اور اس کے منشاء کو خوب پہنچے ہوئے ہیں۔ مگر نقص سے یہ گروہ بھی خالی نہیں۔ اوّل تو یہ لوگ چھوٹا منہ بڑی بات انگریزوں کے ساتھ مساوات کا دم بھرتے پھرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے ہیں۔ چونکہ خود انگریزوں کی قوم کے نہیں۔ اُن کے حقوق پر بالکل نظر نہیں کرتے۔ اور اُن سے منصفانہ صلاح کی توقع نہیں۔ لیکن با ایں ہمہ غایت مانی الباب یہ کہ اس راہ میں چند مشکلات ہیں۔ تو کیا مشکلات پر نظر کرکے وہ راستہ چھوڑ دیا جائے گا جس میں چلنا ضرور ہے*

اگر شروع سے گورنمنٹ نے اس کا خیال کیا

ہوتا۔ تو آج کو یہی ہندوستانی رئیس جن کو میں ننگِ ہندوستان کہتا ہوں۔ یہاں کی کونسل تو خیر ولایت کی پارلیمنٹ کے قابل ہوتے۔ لیکن گورنمنٹ نے ان ہندوستانیوں کے بارے میں بڑی غلطی کی اُن کو شتر بے مہار کی طرح مطلق العنان رہنے دیا۔ کہ پیٹ بھر کر بگڑیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا ان ریاستوں کی خرابی کو گورنمنٹ انگریزی اپنے استحکام کا موجب سمجھتی ہے۔ اب فرض کیجئے۔ کہ ہم اُن رئیسوں کو کونسل میں بٹھانے لگیں۔ تو شروع شروع میں اُن کی کارروائی ضرور ویسی ہی ہوگی جیسی تھوڑی دیر ہوئی مَیں نے بیان کی۔ لیکن اگر ہم چندے صبر کریں۔ تو آخر ان رئیسوں کو کبھی فراغت آئے گی۔ کبھی تو شرمائیں گے۔ میں تو کہتا ہوں۔ کہاں کا کالج اور کیسے مدرسے۔ رئیسوں کے حق میں تو یہی کونسل کافی ہے۔ علی سبیل البدلیت سب کو کونسل میں بٹھایا جائے۔ اور پھر ایسا چکر بندھے۔ کہ مثلاً ہر پانچویں برس کونسل میں حاضر ہونے پر مجبور کیے جائیں۔ پھر دُوسری نوبت میں ہی دیکھیے۔ کہ اُن کی حالت میں کس قدر ترقی ہوتی ہے*

غرض گورنمنٹ کا یہ رنگ کہ وہ ملک کا انتظام رعایا کی رائے پر کرنا چاہتی ہے۔ ہندوستان کی

گورنمنٹ میں تو ہے نہیں۔ ہندوستانیوں کی قسمت کی جو ڈسپاٹک گورنمنٹ سدا سے تھی۔ اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ پہلے گورنمنٹ اپنی تھی۔ اب اس پر اجنبی مسلط ہیں۔ ہمیشہ سے ہندوستان سارے جہان میں بدنام ہے۔ کہ اس میں چاندی اور سونے کی ندیاں بہتی ہیں۔ اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ ملک زرخیز اور سیر حاصل ہونے میں روئے زمین پر اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ لیکن ایک ایشیائی شاعر نے ہندوستانیوں کے حسب حال کیا اچھا کہا ہے ؎

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبر کامِل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

اگر آپ صبر اور توجہ سے سننا چاہیں۔ تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر بیٹھوں۔ میں آپ صاحبوں کو اس کا یقین کرا دوں گا۔ کہ ہندوستان کی رعایا پہلے کی نسبت بہت سقیم الحال ہو گئی ہے۔ اور یوماً فیوماً سقیم الحال ہوتی چلی جاتی ہے۔ ذرائع معاش کے اعتبار سے ہندوستان کے لوگ چار طرح کے ہیں اوّل کسان۔ دوئم اہل حرفہ۔ سوم نوکری پیشہ۔ چہارم تجارت پیشہ۔ کسان کی قسم میں تعلقہ دار سے لے کر ہلواہے تک زمیندار۔ کاشتکار با اقسامہم سب داخل ہیں۔ جو زمین سے معاش پیدا کرتے ہیں۔ انگریزی عملداری

سے پہلے نہ کوئی رقبہ کی پیمائش کرتا تھا۔ اور نہ اقسام زمین دیکھتا تھا۔ پچھلی جمع پر نظر کر کے یا بہت سیانپت کی۔ سرسری طور پر صورت دیکھ کر گاؤں پیچھے اٹکل پچو ایک جمع ٹھہرا دی۔ چھٹی پائی۔ اِس کے ہزاروں لاکھوں تحریری ثبوت موجود ہیں۔ کہ ہندوستانی گورنمنٹ میں طرح طرح کے ظلم ہوتے تھے۔ مگر سرکاری مال گذاری کے بارے میں ہمیشہ الٹی سرکار ہی مظلوم تھی۔ زمیندار لوگ کار پردازان سرکاری کے ساتھ سازش کر کے جمع کم کراتے چلے جاتے تھے۔ اور پھر جمع کے وصول کا یہ حال تھا۔ کہ شاذ نادر کوئی بھلا مانس زمیندار وقت پر دیتا ہوگا۔ دو دو چار چار برس کی باقی داری تو ایک بات تھی۔ جب باقی بہت بڑھ جاتی تھی۔ تو آخر کو آدھی تہائی پر فیصلہ ہوتا تھا۔

رہے کاشتکار۔ ان کو تو یوں سمجھو۔ کہ گویا سرکار کی رعیت ہی نہ تھے۔ اور اُن کا نیک و بد۔ نفع و نقصان سب با اختیار زمیندار۔ مگر چونکہ زمینداروں کا اپنا مفاد تھا۔ ہر زمیندار کاشتکاروں کو اپنی دولت سمجھتا تھا۔ ضرورت پڑے پر تخم و تقاوی سے اُس کی مدد کرتا۔ خرید مویشی اور شادی بیاہ تک کے لئے اس کو قرض دیتا۔ پھر نقدی لگان کا دستور نہ تھا۔

فصل پک کر تیار ہوئی۔ زمیندار کاشتکار دونوں نے غلّہ بانٹ لیا۔ کم ہؤا تو کم اور زیادہ ہؤا تو زیادہ۔ نہ حجّت نہ تکرار۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ یہ ہے خُلاصہ ہندوستانی سرکاروں کے انتظام مالگذاری کا*

اب گورنمنٹ انگریزی کے انتظام کو دیکھنا چاہئے کہ اوّل تو مزروعہ افتادہ بنجر چپّے چپّے کی پیمائش کرائی۔ پھر مٹّی کی ذات اور کھاد اور آب پاشی کے لحاظ سے کھیت کی حیثیت دریافت کی۔ اور پھر کاغذات دیہی اور لوگوں کی گواہی اور ذاتی تجربے سے یہاں تک تحقیق کیا۔ کہ اس کھیت میں یہاں تک پیداوار کی قابلیت ہے۔ اِس طرح پر جزرسی کے ساتھ گاؤں کی نکاسی نکال کر کہنے کو آدھ اور واقع میں اچھا خاصہ کسا ہؤا دو تہائی حق سرکار ٹھہرا دیا اور اتنی کا دعوٰی پر بھی ہمیشہ کے لئے نہیں۔ بلکہ غایت درجہ تیس برس کے لئے کہ اتنے میں زمیندار پھر کچھ پنپیں گے۔ تو پھر نچوڑیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ سرکار اپنا حق واجب نہ لے۔ اُس نے پیمائش سے اقسام زمین وغیرہ کی تحقیقات سے اپنے مطالبے ٹھیرانے میں اگر احتیاط سے کام کیا تو ٹھیک۔ درست کیا۔ مگر میرے کہنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ رعایا اور سرکار کا تعلق من وجہ بندے اور خدا کا تعلق ہے۔ یہاں اِنصاف سے کام نہیں چلتا

بلکہ رحم و رعایت سے۔ سرکار کو قرار داد جمع میں ایک سُود خوار بنیئے کی طرح دمڑی دمڑی اور اَدّھی اَدّھی کا حساب نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ خصوصاً ایسی رعایا کے ساتھ جو پچھلی سلطنتوں میں کار پردازانِ سلطنت کی نمک حرامی یا بد دیانتی یا اپنی خود سری اور چالاکی سے چنگی کی طرح سرکاری مالگذاری ادا کرنے کی خُوگر رہی ہے۔ پھر بندوبست کا میعادی ہونا گروہ زمینداران کی سخت بے دلی کا موجب ہے۔ اور اگر سچ پوچھیے۔ تو ملکی ترقّی کا مانع۔ کوئی رعایا کیسی ہی سرکار کی خیر خواہ اور اطاعت گذار کیوں نہ ہو۔ کیوں پسند کرے گی۔ محنت کرے وُہ۔ لاگت لگائے وہ اور جب زمین کی حیثیت درستی پر آجائے تو سرکار محاصل میں سے آدھا تقسیم کرانے کو آموجود ہو۔ پچھلی سلطنتوں میں ہر گاؤں بجائے خود ایک چھوٹی سی ریاست تھا۔ اب سرکار انگریزی کے انتظام مالگذاری نے زمینداروں کو ایسا مجبور اور بے دست و پا کر دبا ہے۔ کہ اکثر صورتوں میں زمینداری ایک مصیبت ہو گئی ہے۔ سرکار نے کاشتکاروں کے ایسے حقوق تسلیم کر لئے ہیں۔ کہ زمیندار کا کاشتکاروں پر ذرا بھی دباؤ باقی نہیں رہا۔ زمیندار کسی کاشتکار کو کھیت سے بے دخل کرنا چاہے۔ کیا

مقدور ہو کھیت کی پیداوار کو اٹکانا چاہے۔کیا طاقت ہے سختی اور تنگ طلبی کے ساتھ لگان وصول کرنا چاہے کیا مجال ہے سرکار اپنا لینا عین وقت پر زمیندار سے لیتی ہے۔ اور جو زمیندار کو کاشتکار سے پانا ہے۔ اُس کے لیے حکم ہے۔کہ نالش کرو۔ ڈگری جاری کراؤ۔ خلاصہ یہ ہے۔کہ سرکار کے اِنتظام مال گذاری نے زمینداروں اور کاشتکاروں میں ہمدردی اور معاونت کی جگہ عداوت اور کشمکش پیدا کر دی ہے۔ اور اب وہ اگلے بھی جتھے ٹوٹ پھوٹ کر گھر گھر چودھری اور کھیت کھیت زمیندار ہو گئے۔ میں نہیں جانتا۔ آپ لوگوں میں اس طرح کی کوئی کہاوت ہے یا نہیں۔ مگر مَیں یقین کرتا ہوں۔ضرور ہو گی۔ عربی میں تو ایک مثل مشہور ہے۔ الاتفاق قوۃ۔ پس ہر ہر گاؤں اگر اگلی سی زمینداری ہو۔ تو اپنی اپنی بساط کے موافق ایک قوۃ ہے۔ اور اِن کا مجموعہ ایک بلا کا زور ہے۔ ناممکن المقاومت۔ یہ زور اگر گورنمنٹ کا مساعد ہو سکے تو مَیں نہیں خیال کر سکتا کہ گورنمنٹ کو روپے کی سپاہ و آلاتِ حرب کی۔ اعوان و انصار کی۔ کسی قسم کی دوسری قوّت درکار ہو۔ لیکن گورنمنٹ نے بجائے اِس کے کہ اس قدرتی خدا داد زور سے فائدہ اٹھائے اس کو ضائع اور معدوم کر دینا آسان سمجھا۔ اور ضائع

اور معدوم کر دیا۔ اِس بارے میں گورنمنٹ کی عقل
اُس جوگی کی عقل سے کچھ زیادہ تعریف کی مستحق
نہیں۔ جو اپنے ہاتھ کو خشک کر ڈالتا ہے۔ اس خیال
سے کہ وہ شاید اس ہاتھ سے کسی گُناہ کا مرتکب ہو۔
زمیندار تو اس وجہ سے گر رہے۔ کہ ان کو گورنمنٹ نے
قصداً گرا دیا۔ رہ گئے عام کاشتکار۔ وہ سدا سے اِس
بات کے خوگر تھے۔ کہ زمیندار اُن کو انگلی پکڑا کر رہے اچھلے
تو آگے کو پاؤں اٹھائیں۔ اب وہ زمیندار تو ہوئا دست
بردار۔ اِن میں کھڑے رہنے کا بوتا نہیں۔ یہ بھی گر رہے
اور ایسی بُری طرح گرے۔ کہ سرکار نے اِن کو اپنے
پندار میں گڑھے میں پڑا ہوُا دیکھ کر باہر نکالا۔ یہ جو
لڑکھڑائے۔ تو دھڑام سے کوئیں میں۔ زمیندار اِن کو
دباتے بھی تھے۔ اور ستاتے بھی تھے۔ مگر یہ بھی نہیں
دیکھ سکتے تھے۔ کہ بگڑ جائیں۔ اُجڑ جائیں۔ اب ان کو
پالا پڑا بنیوں سے۔ ساہوکاروں سے۔ مہاجنوں سے!
جن کا دھرم یہ ہے۔ کہ اِن تِلوں کو پیلیئے جہاں تک پیلا
جائے۔ اور پھر ان کی کھلی کو سانی والوں کے ہاتھ بیچ کر
کوڑے سیدھے کیجئے۔ اب کاشتکاروں کا حال کیا
ہے۔ کہ ہزار میں سے شاید دو چار بچے ہوں۔ تو خبر
نہیں۔ ورنہ سب کے سب گویا مہاجنوں کے مزدور
ہیں۔ اتنا نہیں۔ کہ کسی کے گھر سے وقت پر بیج نکل

آئے۔ کھیت میں ہزار نعمتیں پیدا کیوں نہ ہوں۔ اُن کی اور اُن کے بال بچوں کی تقدیر کا ساتواں کودوں۔ جو نبی اسرائیل کے منّ و سلوٰی کی طرح ستو باندھ کر پیچھے پڑا ہے۔ کیا مجال کہ کبھی ناغہ ہو جائے۔ ایک دفعہ ایک مہاجن کو چھُو جانا شرط ہے۔ غرض جتنے کسان پیشہ ہیں۔ کیا زمیندار کیا کاشتکار سب تباہ اور خستہ حال ہیں۔ چوں کہ سرکاری مال گذاری وقت مقررہ پر وصول ہو جاتی ہے۔ سرکار سمجھتی ہے۔ انتظام مال گذاری اچھا ہے۔ زمیندار و کاشتکار مقدور والے ہیں۔ رعایا کا اصلی حال سرکار پر منکشف ہو بھی تو کیونکر ہو۔ جو شخص ایسی فریاد کو سرکار کے کان تک پہنچا سکتا ہے ہو نہ ہو یورپین ہی حاکم ضلع ہو۔ ہندوستانی حاکموں میں سے تو نہ کسی کی ایسی وقعت اور نہ کسی میں اتنی جرائت۔ رہا حاکم ضلع وہ حتی الوسع سوتی بھڑوں کو کیوں جگانے لگا۔ اگر وہی مجوّز جمع بھی ہے۔ تو پہلے اس کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا ضرور ہوگا۔ اور معمولی حالتوں میں انسان سے ایسی توقع کرنا فضول ہے۔ اور نہ مجوّز جمع نہ بھی ہوتا تاہم محصل تو چار و ناچار ضرور ہوگا۔ وہ جوشِ اظہار کارگذاری میں وصول جمع کو ملتوی یا موقوف کر نہیں سکتا۔ اور پھر تخفیف جمع کی تحریک کرنا بیٹھے بٹھائے ایک جواب نہی کا مول لینا ہے۔ گورنمنٹ

ایسے مین میکھ نکالتی ہے۔ (اور اس کا حق بھی ہے) کہ اس کا رضامند کرنا ایک مصیبت ہے۔ یہ ہے خلاصہ ہمارے اِنتظام مالگذاری کا جو کم سے کم دو ثلث رعایا پر مؤثر ہے +

اہل حرفہ کی کیفیت، کِسانوں سے کہیں بد تر ہے۔ یہ سچ ہے۔ کہ گورنمنٹ ان کے حال سے کم تعرض کرتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ نہیں کرتی۔ مگر یورپ کی کلوں نے ان کو مار پٹڑا کر دیا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بہت سے عمدہ اور یافت کے پیشے معدوم ہو گئے۔ اور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب کہاں ہیں وہ ڈھاکے کے ململ۔ بنارس کے مشروع۔ اورنگ آباد کے کمخواب۔ بیدر کے برتن۔ کالپی کے کاغذ۔ کشمیر کی شالیں۔ لاہور کے ریشمی چوڑیئے؟ اہل یورپ کیا اس پر بند ہیں۔ کہ جس چیز کی مانگ ہندوستان سے ہوئی۔ بنائی بھیج دی۔ نہیں وہ لوگ رات دن اس ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ کہ ہندوستان میں کیا کیا چیز پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ انسان کے کس مصرف کی ہے۔ اور اس مُلک کے لوگوں کو کیا درکار ہے۔ کہ ہندوستان سے ہر طرح کی پیداوار ولایت ڈھلی چلی جاتی ہے۔ کچھ تو یورپ میں کھپی۔ اور کچھ ہندوستان کے مصرف کی بن کر اُلٹی آ گئی۔ ہندوستانی اہلِ حرفہ

تھکے تو یوں تھکے۔ کہ یہ جو کچھ کریں۔ اپنے ہاتھ پاؤں سے۔ اور انسان کی قوّت کا اندازہ معلوم ہے۔ آٹھ پہر میں آخر وہ دم بھی لے گا۔ آسائش بھی کرے گا۔ اور وہاں یورپ میں کلیں ہیں۔ کہ سارے سارے دن۔ ساری ساری رات بے تکان پڑی چل رہی ہیں ہندوستانیوں میں کلوں کا ایجاد کرنا تو کجا۔ کلوں سے کام لینے کے سلیقے کو بھی عمریں چاہئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ ہندوستان میں اہل حرفہ کی تباہی خود انہی کی نادانی کی وجہ سے ہے۔ مگر ہندوستانی اِس درجہ کے جاہل اور کاہل ہیں۔ کہ اِن میں اپنی حالت کے درست کرنے کی گدگدی خدا نے پیدا ہی نہیں کی یہ تو گورنمنٹ سے چاہتے ہیں۔ لاو دو۔ لدا دو۔ لادنے والا ساتھ دو۔ یورپ کی تمامتر ترقّی کا اصلی اور حقیقی سبب علوم جدید ہیں۔ اور اس زمانے میں تعلیم وہی مفید ہو سکتی ہے۔ جس سے یہاں کے لوگ ان علوم سے آگاہی بہم پہنچائیں۔ اور اُن کی طبیعتوں میں اس بات کا شوق پیدا ہو۔ کہ واقعات کو سوچیں اور موجودات میں غور کریں۔ سو سرشتۂ تعلیم کا اِتنا تو اثر ضرور دیکھنے میں آتا ہے۔ کہ جن لوگوں میں لکھنے پڑھنے کا دستور نہ تھا۔ وُہ بھی اب اپنے بچّوں کو پڑھانے لگے ہیں۔ بلکہ اِس قسم کے لوگ بکثرت ہیں۔ انگریزی کا شوق بھی بر سر ترقّی

ہے - اور شکر ہے - اگلی سی وحشت اور نفرت کا کہیں پتا نہیں - صرف مسلمانوں کو احمقانہ تعصب کی وجہ سے رُکاوٹ ہے - وہ بھی عارضی - چند روزہ - مگر اِس تعلیم سے مُلک کو فائدہ کے عِوض اُلٹا نقصان پہنچنے والا ہے - لوگ صرف نوکری کی طمع سے پڑھتے ہیں - نوکری ہی ان کے نزدیک پڑھنے کی غرض و غایت ہے - نوکری ہی کے لیۓ ان کو تیار بھی کیا جاتا ہے - اور ان کا مبلغ علم بھی وہیں تک ہے - مجھ کو حقیقت میں سخت حیرت ہے - کہ اتنی نوکریاں کہاں سے آئیں گی - مَیں ایسا خیال کرتا ہوں - کہ انگریزی عملداری میں لکھنے پڑھنے کی اس قدر کثرت کچھ اس وجہ سے بھی ہے - کہ سرکاری نوکری بِلا امتیاز شریف و رذیل ہر ایک کو حاصل ہو سکتی ہے - اور یہی سبب ہے - کہ کمینوں میں علم کا رواج زیادہ ہوتا جاتا ہے - پس اگر سچ پُوچھیۓ - تو سررشتۂ تعلیم سے جیسا کہ اب ہے - مُلک کا اُلٹا عِلاج ہو رہا ہے - ہم کو درکار تھے وہ علوم جو صنعت و حرفت کو ترقی دیں - اور اب لوگوں کو ایسی پٹی پڑھائی جاتی ہے - کہ موروثی اور آبائی پیشوں اور حرفوں سے گریز اور نفرت کرتے ہیں - بلکہ انہوں نے اس عار سے بچنے کے لیۓ پڑھنا شروع کیا ہے ◆

اب مجھ کو صرف تجارت پیشہ لوگوں کی نسبت کچھ کہنا چاہیئے۔ سو میں اس کو مانتا ہوں۔ کہ انگریزی عملداری میں اِس پیشے کے لوگوں کو کسی طرح کی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔ امن میں کسی طرح کا تزلزل نہیں۔ مال کی آمد و شد میں یوماً فیوماً سہولت زیادہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ عدالت کی کارروائی لائق اطمینان ہے۔ تاجر کو اور چاہیئے کیا۔ مگر تجارت کو چاہیئے سرمایہ اور سرمایہ ہی کا تو رونا ہے۔ پس یہ پیشہ ایک محدود پیشہ ہے۔ جس کو ہندوستان میں صرف معدودے چند اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک۔ دوسرے حرفے اور صنعت کا کساد عین تجارت کا کساد ہے۔ اور میں ابھی تھوڑی دیر ہوئی ثابت کر چکا ہوں۔ کہ ہمارے ملک کی صنعت پر اوس پڑتی چلی جاتی ہے۔ پس اسی نسبت سے تجارت میں بھی کمی ہے۔ سچ پوچھیئے تو ساری تجارت اہلِ یورپ کی مٹھی میں ہے۔ اور میں ہندوستانیوں کو تاجر نہیں بلکہ تاجروں کا دلال سمجھتا ہوں۔ ولایت سے مال منگواتے ہیں۔ اور اُس کے طفیل میں روپے پیچھے دھیلا دمڑی آپ بھی جھاڑ کھاتے ہیں*

اس وقت تک میں نے رعایائے ہندوستان کو چار بڑے پیشوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کی خستہ حالی کو اپنے پندار میں دلائل عقلی سے ثابت کیا۔ اب

ہیں بہت نہیں۔ گنتی کی چند عام باتیں بیان کروں گا جو بلا تخصیص کسی پیشے کے عام ہندوستانیوں پر موثر ہیں۔ اور ان کو کم و بیش ہندوستانیوں کے افلاس میں دخل ہے۔ ہندوستان کے لوگ عادتاً سادگی اور کفایت شعاری سے زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ ان کے پاس اگر روپیہ ہو۔ تو کھانے پینے کے ضروری مصارف کے بعد اُس کا زیور اپنی عورتوں کو گھڑوا دیتے ہیں۔ یا یُوں کہو کہ اس کو اس پیرائے میں جمع رکھتے ہیں۔ تو جس قوم میں عموماً سادگی اور کفایت شعاری کا دستور متوارث ہو۔ اُس کے اکثر افراد علیٰ قدر مراتب سرمایہ دار ہونا چاہیئے۔ اور انگریزی عملداری سے پہلے ہم میں اکثر لوگ خوشحال تھے بھی۔ اب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ادنیٰ اور اعلیٰ سب کے خرچ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور اُس کے چند در چند اسباب ہیں۔ اوّل یہ کہ تکلّف اور آرائش اور نمود و نمائش کی نئی نئی چیزیں ولایت سے آکر رواج پاتی ہیں۔ اور زندگی کے لئے جدید ضرورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ خرچ کے لئے اِس کثرت سے موجبات ترغیب جمع ہو گئے ہیں۔ اور ہوتے جاتے ہیں۔ کہ انسان کیسا ہی جُز رس کیوں نہ ہو۔ ہاتھ کو نہیں روک سکتا۔ مثلاً جہاں کہیں ریل جاری ہے۔ آمد و شد میں ریل کی وجہ سے اس قدر سہولت ہو گئی ہے۔ کہ جو لوگ کبھی گھر

سے باہر نکلنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ اب ذرا ذرا سی ضرورتوں پر چل کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر ریل میں چلنا ٹھہرا۔ تو کپڑوں کی گٹھڑی کو کون سنبھالتا پھرے۔ سب سے بھلا بیگ۔ کپڑے اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں بھر اوپر سے قفل لگا۔ مزے سے ہاتھ میں لٹکا لیا۔ پھر سفر کا نام سفر۔ دور جانا ہو یا نزدیک۔ آخر روپیہ پیسہ بھی تھوڑا بہت ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔ نیفے میں رکھو تو مشکل۔ ازاربند میں باندھو تو بدنما۔ جیب کا بھروسا نہیں؛ بیگ کا بار بار کھولنا۔ بند کرنا۔ کوئی چیز گر پڑے کیا ضرور۔ ہر مرتبہ خریدنا نہیں۔ لاؤ بھئی گلے میں لٹکانے کا چمڑے کا بٹوا خرید لیں۔ مدتوں کے لئے چھٹی ہوئی لیکن کمبخت حقے کی کیا تدبیر کرنی ہوگی۔ سنا ہے کہ ریل میں تو پینا نہیں ملتا۔ چلتی گاڑی میں لوگ چوری چھپے کوئلے سلگا کر اپنا کام کر لیتے ہیں۔ پر ایسے حقے میں کیا خاک مزہ ملتا ہوگا۔ سوکھا ہوا نیچا۔ خالی حقہ۔ اس پر گھبراہٹ کہ ایسا نہ ہو کہ اسٹیشن آ جائے۔ چرٹ سب سے اچھا کہ خاصی طرح دندناتے ہوئے پیتے چلے جا رہے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں۔ کہ ہوں تو کہے۔ اور ساتھ کے بیٹھنے والے بھی دیکھ کر جی میں ضرور کہتے ہونگے۔ کہ ہاں بھئی یہ بھی کوئی ہیں۔ پر چرٹ ہیں کڑک جاتے کا بڑا عیب ہے۔ اور پھر کمبخت

دُھواں نہیں دیتا۔ سارا بکس لیں۔ تو حفاظت سے رہے۔ بنچ کے نیچے کہیں بھی ڈال دو کچھ پروا نہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا دیسی چرٹوں کا بکس آٹھ آنے دس آنے کو آئے گا۔ کیا بڑی بات ہے۔ راستہ تو آرام سے کٹے گا۔ ریل میں نکمّے بیٹھے ہوئے اس سے بہتر کوئی دُوسرا مشغلہ نہیں۔ حقّے میں بڑا کھڑاگ ہے۔ نیچہ حُقّہ۔ چلم۔ توا۔ کوئلے۔ خدا کی پناہ۔ ایک آدمی کا بوجھ تو یہی ہو گیا۔ آدمی اپنے تئیں سنبھالے یا اتنے بکھیڑے کو لادے لادے پھرے۔ چُرٹ کے لیئے صرف ایک ڈبیا دیا سلائی کی چاہیئے ہوگی۔ سو حقّے کی صورت میں بھی رکھنی پڑتی۔ سڑک کے کنارے بیٹھے لڑکے پکار رہے ہیں۔ "دمڑی ٹکے کے تین بکس"۔ دمڑی تو اپنے مُنہ سے کہتا ہے۔ ٹکے کے تین دیگا۔ ایک پیسہ کا ڈیڑھ۔ یہ حساب تو ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ ایک بکس لیں۔ تو کوڑیاں باندھنی پڑینگی۔ کام کی چیز ہے۔ ریل بھی جلائے۔ تو جہاں دُھوپ دکھائی۔ بارود کی طرح چھٹنے لگی۔ آؤ اکٹھے تین بکس لے لو۔ پڑے رہیں گے۔ پھر کام آئیں گے۔ یُوں ضرورتوں کا سلسلہ ہے۔ کہ چُپکے چُپکے یکے بعد دیگرے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح ڈاک کے اِنتظام نے باہمی خط و کتابت کو اس قدر بڑھا دیا ہے۔ کہ کاتب اور مکتوب الیہ چاہے دونوں میں ایک بھی

پڑھا ہؤا نہ ہو۔ اور کتنے ہی غریب کیوں نہ ہوں۔ زیادہ نہیں تو خیر مہینے کے مہینے ایک دوسرے کی خیر صلاح کی خبر لینی تو ضرور ہے +

یہ میرے ہوش کی بات ہے۔ کہ ہمارے ملک میں چھتری کو لازمۂ امیری سمجھا جاتا تھا۔ اب یہاں تک نوبت پہنچی ہے۔ کہ کسی بڑے بازار میں دھوپ کے وقت کھڑے ہو کر دیکھیئے۔ تو اِس سرے سے اُس سرے تک چھتریوں کا ایک سائبان تنا ہؤا معلوم ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں۔ کہ کیا اب ہمارے مُلک میں موم کے آدمی پیدا ہوتے ہیں۔ کہ دھوپ لگی اور پگھلے۔ یا مثلاً ایک کپڑے پر نظر کیجیۓ۔ کہ اس کے ضروری ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ ولایت سے قسم قسم کے وضع دار کپڑے بن بن کر چلے آتے ہیں۔ کہ خواہ مخواہ آدمی کا دِل اُن کے پہننے کو چاہتا ہے۔ اور چونکہ کلوں کی وجہ سے سستا بہت ہے۔ اکثر آدمی اس کی وضع داری پر فریفتہ ہو کر بلا ضرورت بھی بنا لیتے ہیں۔ اور پھر اس کے استعمال میں بھی چنداں احتیاط نہیں کرتے۔ میں ایسا خیال کرتا ہوں۔ کہ سویلیزیشن اور اسراف لازم و ملزوم ہیں۔ پس جس قدر ہندوستانیوں میں سویلیزیشن کی ترقی ہوگی۔ ضرور ہے۔ کہ ان کا خرچ بڑھے۔ اگر اسی نسبت سے ہندوستانی اپنی آمدنی بھی بڑھا سکتے

تو کچھ پروا کی بات نہ تھی۔ مگر آمدنی اُلٹی گھٹ گئی ہے۔ اور خرچ کی زیادتی اُن کو اکھرا ہی چاہیئے۔ عام لوگ جن کی معلومات کا دائرہ تنگ ہے۔ اور جن کو سوچنے اور غور کرنے کی عقل نہیں۔ سب کے سب بالاتفاق کہتے ہیں۔ کہ انگریزی عملداری میں امن ہے انصاف ہے۔ زور نہیں۔ ظلم نہیں۔ مگر خدا جانے کیا بات ہے۔ اگلے وقتوں کی سی خیر و برکت نہیں۔ روپیہ ہے۔ کہ ٹھیکری کی طرح اُٹھا چلا جاتا ہے۔ اور اس پر پیٹ کو روٹی ہے۔ تو تن کو کپڑا نہیں۔ اور کپڑا ہے تو روٹی نہیں۔ اور ہو تو کہاں سے ہو۔ وہ اگلے سے سمے ہی گئے گذرے ہوئے۔ بزرگوں کے عیش تو بزرگوں کے ساتھ گئے۔ یہ تو ہمارے ہوش کی بات ہے۔ کہ ایک روپے کا غلّہ ایک آدمی سے اُٹھائے نہیں اُٹھتا تھا۔ بھلا سمے کا کچھ ٹھکانا ہے۔ روپے کے چھ دھڑی گیہوں داؤدی صاف ستھرے۔ ساڑھے تین سیر چار سیر کا دانہ دار خالص گھی۔ پانچ سیر کی سفید بُراق کھانڈ۔ بیس سیر کا گڑ۔ دس من کے اُپلے اور علیٰ ہذا القیاس اب جس چیز کو دیکھو۔ آگ لگ رہی ہے۔ روپیہ اِدھر بُھنا اُدھر ندارد۔ بدبے کے ٹھہرانے میں غلطی ہو۔ مگر سمے کی شکایت بھی بے اصل نہیں۔ یہ بالکل سچ ہے۔ کہ اگلی سی برساتیں نہیں

ہوتیں۔ زمین ہے کہ جنگل اور باغات کٹ کٹ کر برابر مزروعہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور علم طبعی میں یہ مسئلہ حد متیقن کو پہنچ گیا ہے۔ کہ درخت بالخاصہ افراط بارش کے سبب ہوتے ہیں۔ اور جنگلی علاقوں میں بارش کا بکثرت ہونا اس کا شاہد ہے۔ پھر زمینداروں کو تشخیص جمع میں ایسا دھر کر کسا ہے۔ کہ گاؤں کا سارا رقبہ ہر سال جوتا بویا نہ جائے۔ تو سرکاری جمع گھر سے بھرنی پڑے۔ پس زمیندار بہ مجبوری زمین کو مطلق دم نہیں لینے دیتے۔ اِن کا بس چلے تو ایک فصلی زمین سے دو اور دو فصلی سے چار فصلیں پیدا کریں۔ یوں زمین بے دام اور کمزور اور اُن کی قوتِ پیداوار گھٹتی چلی جاتی ہے۔ جس کو عوام بے برکتی سے تعبیر کرتے ہیں +

لوگ انگریزی عملداری کی نسبت بھی ایسا خیال کرتے ہیں۔ کہ اس عملداری میں بے ایمانی بہت پھیلتی جاتی ہے۔ لوگوں میں اگلی سی راست معاملگی نہیں رہی نیتوں میں فساد۔ دلوں میں دغا۔ باتوں میں جھوٹ۔ جس کا ضروری نتیجہ یہ ہے۔ کہ بات بات میں لوگ ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ہیں۔ جب عدالت میں جا کر دیکھو۔ مقدمات کی یہ کثرت ہے۔ کہ حاکم کو سر کھجانے تک کی فرصت نہیں۔ اور جہاں ایک دفعہ عدالت جھانکی۔ اور جھگڑا

سریش کی طرح چمٹا۔ اوّل تو ایک کے اوپر ایک عدالتیں ہی اتنی ساری ہیں کہ ان شیرے کے کھیتوں میں سے نکلنا مشکل۔ وکیل مختار ایسے دم جھانسے دیتے ہیں کہ کیسا ہی سیانا آدمی کیوں نہ ہو اِن کے دھوکے میں آ ہی جاتا ہے۔ پھر عدالت کے اِنصاف کی نسبت لوگوں کی عام رائے ہے کہ جو جیتا وہ ہارا اور جو ہارا سو مرا۔ اور فی الواقع عدالتوں کی کاروائیاں اس قدر اُلجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ اسٹامپ اور طلبانوں اور محنتانوں اور مشکرانے کے خرچے کے مارے فریقین اُدھڑ جاتے ہیں یعنی عدالت میں مقدمہ جیتنے کے معنے یہ ہیں کہ جائداد متنازعہ فیہ نذر خرچۂ عدالت۔ حقیقت میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب قاعدے قانون اِنسداد فساد کی غرض سے جاری کئے جاتے ہیں۔ اور نتائج کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے گویا قانون باعثِ فساد ہے۔ میرے ایک دوست ایک ہندوستانی ریاست میں نوکر ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا تھا کہ کیوں صاحب آپ کے ہاں عدالتوں کا چنداں اہتمام معلوم نہیں ہوتا اور قانون بھی آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں منضبط نہیں۔ پھر لوگ کیا کرتے ہوں گے؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ اوّل تو ہماری رعایا اِس قدر جھگڑالو نہیں۔ کسی بات میں اختلاف ہؤا بھی تو اکثر آپس میں رفع دفع کر لیتے

ہیں اور جو شاذ نادر ہم تک فریاد لائے تو ذرا سی ہی کوشش میں ایک دوسرے کے حلف پر حصر کر دیتے ہیں یا پنچایت پر راضی ہو جاتے ہیں۔ وہ اس بات کی تصدیق کرتے تھے کہ وہاں کے لوگ جھوٹ کم بولتے ہیں اور بڑے شد و مد کے ساتھ کہتے تھے کہ میں پندرہ برس سے ایک بڑے علاقے کا عامل ہوں اور صدہا مقدمے میرے ہاتھ تلے آئے۔ آج تک میرے کان میں یہ بھنک تک نہیں پڑی کہ کسی نے جھوٹا حلف اٹھایا۔ اگر عدالتوں کو لوگوں کے اخلاق کی کسوٹی نہ سمجھا جائے۔ تو میں ایک دوسری دلیل پیش کرتا ہوں۔ شراب خواری کی کثرت۔ جو شخص اس چیز کو مذہباً ممنوع نہ سمجھے اور وہ اعتدال کے ساتھ اس کا استعمال کرے۔ تو مجھ کو اس پر طعن کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اور مجھ کو اس پر طعن کرنا منظور بھی نہیں میں اس موقع پر اتنا ہی ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ آیا تمول کے اعتبار سے ہندوستانیوں کی ایسی حالت ہے کہ ان کو شراب خوار بننے دیا جائے۔ جس سے آخرکار جواری۔ فضول خرچ۔ کاہل۔ عیاش۔ چور۔ ڈاکو اور انواع و اقسام کے امراض خبیثہ میں مبتلا ہو کر ایسی مصیبت مندانہ زندگی بسر کریں کہ عذاب ہوں اپنے حق میں اور سوسائٹی کے حق میں۔ یہ ہرگز اصول نہیں

ہونا چاہیئے۔ کسی عاقل گورنمنٹ کا۔ اور خاص کر انگریزی گورنمنٹ کا جو عقل کے علاوہ ایک پاکیزہ مذہب کا فخر بھی رکھتی ہے۔ اگر گورنمنٹ ایسی بڑی چیز کی جس کو ہمارے سچے پیغمبر نے اور آپ کے نزدیک عرب کے بڑے ریفارمر نے بواجب ام الخبائث کہا ہے۔ اور ہر ایک زمانے کے عقلاء نے اس کی بُرائی کی ہے اور ڈاکٹروں نے اس کے نقصانات پر اجماع کیا ہے۔ بندی نہیں بلکہ روک کر سکتی ہے۔ تو گورنمنٹ یہ تقاضائے مصلحت ملکی کیوں اپنا سارا زور سختی کے ساتھ اس کے روکنے میں صرف نہ کرے۔

اب مجھ کو آپ صاحبان کی سامعہ خراشی کرتے ہوئے بہت دیر ہو گئی اور میں ڈرتا ہوں کہ میں نے نوبل صاحب کی لذیذ ضیافت کو تو بدمزہ نہیں کر دیا۔ بات آ پڑی اسباب غدر کی اور یہ مضمون اس قدر وسیع ہے کہ اگر ہر روز اسی طرح کہا کروں تو کہیں ہفتوں میں جا کر ختم ہو تو ہو۔ تاہم میں نے اجمالی طور پر جس قدر بیان کیا ہے اس سے اتنی بات تو غالباً آپ صاحبوں پر ظاہر ہو گئی ہو گی۔ کہ انگریزی گورنمنٹ غدر سے پہلے تک ممدوح خلائق نہیں رہی مجھ کو میرے ایمان نے اور گورنمنٹ اور رعایا دونوں کی سچی خیر خواہی نے اس کے ظاہر کرنے پر مجبور کیا۔ غدر سے پہلے تک

مجھ کو انگریزی گورنمنٹ سے کسی طرح کا تعلق نہیں رہا اور سوائے اس کے کہ میں شہر میں رہتا تھا۔ گورنمنٹ کا کوئی حق مجھ پر نہ تھا۔ مگر خدا کو یوں منظور تھا۔ کہ مجھ سے اور نوبل صاحب سے ایک عجیب اور غیر متوقع طور پر معرفت ہو۔ میں نے صاحب کو اُس افسوسناک بیہوشی میں اگر لے جا کر اپنے گھر رکھا۔ تو سوائے فرض انسانیت کے اور کوئی خیال باعث نہیں ہوا۔ اُس وقت کوئی دُور اندیش سے دُور اندیش بھی یہ بات نہ سمجھ سکتا تھا کہ غدر کا انجام کیا ہوگا اور یہ اونٹ کب اور کس کروٹ بیٹھے گا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جس وقت میں نے صاحب کو مُردوں میں پڑا دیکھا میرا دل بالکل بے قابو ہو گیا تھا اور میں نے اس وقت اتنا بھی تو نہیں سوچا کہ ان کو گھر میں لے جا کر کہاں چھپاؤں گا اور کیا انتظام کروں گا کہ کسی پر ان کا میرے گھر میں ہونا ظاہر نہ ہو۔ مگر نوبل صاحب کے بارے میں شروع سے آخر تک خدا کی قدرت کاملہ کے ایسے ایسے کرشمے دیکھے کہ بالکل عقل کام نہیں کرتی۔ پس اگر سچ پوچھئے تو ان کو صرف خدا نے بچایا اور میری یا کسی کی تدبیر کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ اگر ان کا بچنا خدا کی اور خدا کی قدرت کی دلیل نہیں ہے تو میرے نزدیک بھر دُنیا میں کوئی چیز کسی چیز کی

ذلیل نہیں۔ مجھ کو جہاں تک نوبل صاحب کے بچانے سے تعلق ہے۔ وہ میری نظر میں اس قدر بے حقیقت ہے کہ مجھ کو اس کا تذکرہ کرتے ہوئے شرم آتی ہے یہ صرف نوبل صاحب کی کریم النفسی تھی کہ انہوں نے ایک ذرا سی بات کو اس قدر رونق دی۔ اگر نوبل صاحب کی خاطر سے میں اس کا قابل قدر ہونا تسلیم بھی کر دوں۔ تو نوبل صاحب اپنی ذات سے اس کا دو چند چار چند اور اس سے زیادہ معاوضہ کر چکے ہیں۔ پس گورنمنٹ نے جو مجھ کو جاگیر دی۔ نوکری دی صرف احسان ہے۔ بلا سابقہ استحقاق اور اگر اتنے بڑے احسان کو خالی شکر گذاری کے ساتھ قبول کر لوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ بے استحقاقی کے علاوہ نا اہلی کا الزام بھی اپنے اوپر لوں۔ جوں ہی مجھ کو نوبل صاحب سے معلوم ہوا کہ گورنمنٹ میرے ساتھ سلوک کرنے والی ہے مجھ کو سوچ پیدا ہوا کہ اس کے معاوضہ میں گورنمنٹ کی کونسی خدمت کر سکوں گا۔ نہ تو میرے پاس مال ہے کہ گورنمنٹ کے نذر کروں نہ میرا پیشہ سپاہ گری ہے کہ میں اپنا سر گورنمنٹ کے لئے کٹوا دوں۔ تب میں نے خیال کیا کہ میرے پاس دل ہے۔ پس میں آپ صاحبوں کے رو برو اس بات کو ظاہر کرتا ہوں کہ میں اپنا دل گورنمنٹ

کی نذر کر چکا۔ خدا نے چاہا تو میری تمام عمر اسی میں بسر ہو گی کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکیگا گورمنٹ کی فلاح میں۔ گورمنٹ کے قیام میں ثبات میں! گورمنٹ کے عام پسند ہونے میں کوشش کرتا رہونگا

اے خدا! تو میرا مددگار رہ ٭

میں نے اپنی کارروائیوں کا منصوبہ ذہن میں ٹھہرا لیا ہے اور میں آپ صاحبوں کی اِجازت سے مجملاً اس کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو ابتدائے شعور سے تاریخ اور اخبار کا بہت شوق رہا ہے۔ اگرچہ اس سے تھوڑی دیر پہلے میں نے گورمنٹ کے انتظام پر سختی کے ساتھ نکتہ چینی کی ہے۔ بااین ہمہ میں اقرار کرتا ہوں کہ انصاف میں۔ انسانی ہمدردی میں۔ رعایا کی آزادی میں۔ رعایا کے مہذّب بنانے میں۔ ملک کی فلاح و بہبودی میں دُنیا کی کوئی گورمنٹ انگریزی گورمنٹ کو نہیں پاتی۔ انگریزی گورمنٹ میں جو نقصان ہیں وہ عملی قسم کے ہیں۔ ورنہ اس گورمنٹ کے اُصول ایسے عمدہ ہیں کہ ان سے بہتر نہ کبھی ہُوئے ہیں اور نہ اب کسی حصۂ روئے زمین میں ہیں۔ میں انگریزی گورمنٹ کو ہندوستان کے حق میں خدا کی بڑی رحمت اور برکت سمجھتا ہوں۔ پس میری تمام ہمّت اس میں مصروف ہو گی کہ رعایائے ہندوستان اس رحمت اور

برکت سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیے۔ انگریزی گورنمنٹ میں جتنے نقصان ہیں آخر کو سب کا یہی ایک سبب جا کر ٹھہرتا ہے کہ حاکم و محکوم میں اختلاط نہیں۔ اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف نہیں۔ میں نے اِس پیرائے میں گورنمنٹ کی خیر خواہی کا بیڑا اُٹھایا ہے کہ حاکم و محکوم میں سے اجنبیت کو دُور کر دوں۔ رعایائے ہندوستان میں سے صرف مسلمان کو میں اس قابل سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ کو ان کی تالیف و استمالت کی سرِدست بہت ضرورت ہے۔ کچھ تو اس سبب سے اور کچھ اس وجہ سے کہ میں خود مسلمان ہوں۔ میری کوشش مسلمانوں میں محصور رہے گی۔ میں مسلمانوں کے رگ و ریشہ سے واقف ہوں اور مجھ کو ہونا بھی چاہیئے کیونکہ مجھ کو خود مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میں بہت وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مذہب اسلام میں کوئی بات ایسی نہیں جس کی وجہ سے گورنمنٹ مسلمانوں کی طرف سے نامطمئن ہو۔ ہمارے پیغمبر صاحب کی زندگی میں دونوں طرح کے نمونے موجود ہیں۔ اُن کی پیغمبری کی عمر میں سے آدھی سے زیادہ مغلوبی کی حالت میں گذری جب کہ قریش مکہ صرف مذہبی مخالفت کی وجہ سے اُن کو اور اُن کے رفقاء کو جو اُن پر ایمان لائے تھے طرح طرح کی ایذائیں

دیتے تھے۔ اور فقط اس وجہ سے کہ یہ لوگ ایک خدا کو مانتے اور بُت پرستی کی مذمت کرتے تھے۔ ان کو کعبے کے معبدگاہ عالم میں آنے سے روکتے۔ ان کو اپنے طور پر خدا کی عبادت نہ کرنے دیتے۔ ان کے ساتھ لین دین تک موقوف کر دیا تھا۔ اور موقع پلتے تو ان پر دست درازیاں کرتے۔ اس حالت میں جو متصل گیارہ برس رہی۔ پیغمبر صاحب کی اپنے معتقدین کو برابر یہی تاکید تھی کہ خدا کی راہ میں دنیوی تکلیفات کو بہ امید فلاحِ عاقبت صبر کے ساتھ برداشت کرو۔ اور مذہب اسلام تھا کہ اِن مزاحمتوں اور مصیبتوں میں اپنی صداقت کی وجہ سے چپکے چپکے ترّقی کر رہا تھا۔ مسلمانوں نے اِن تکلیفات سے عاجز آکر دو بار ترک وطن بھی کیا جس کو ہجرت کہتے ہیں۔ پھر بھی لوگوں نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اس اثناء میں مسلمانوں کا گروہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ اپنی حفاظت کر سکتے تھے۔ دوسری ہجرت کے دوسرے برس بدر کی مشہور لڑائی ہوئی جس سے اسلام کے غلبے کی ابتدا ہے۔ ہم نے تاریخ میں صدہا فتح مند بادشاہوں اور جنرلوں کا بلاد مفتوح میں داخل ہونا پڑھا ہے۔ آگے آگے قتل اور پیچھے پیچھے لوٹ۔ اور ایک فتح مند پیغمبر کا مکّے میں داخل ہونا تھا۔ جہاں کے لوگوں نے ان

کے ساتھ ایذا دہی اور بے حرمتی کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا تھا کہ آپ کعبے میں تشریف رکھتے تھے۔ اور شہر مکہ میں امن عام کی منادی ہو رہی تھی۔ غرض یہ ہے کہ اسلام فی نفسہٖ ایسا عمدہ مذہب ہے کہ ہارے درجے کی مغلوبیت اور اعلیٰ مرتبے کا غلبہ دونوں حالتوں میں اس کے پیرو صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں ◆

مانا کہ انگریزی عملداری میں اسلام کو غلبہ نہیں مگر وہ اس قدر مغلوب بھی نہیں جیسا ہجرت سے پہلے مکے میں تھا۔ بدون سلطنت کے جس قدر مذہبی آزادی ممکن ہے مسلمانوں کو انگریزی عملداری میں پوری پوری حاصل ہے۔ بلکہ خود مسلمانوں کی عملداری میں بھی آزادی کا یہ رنگ نہیں۔ پس من حیث المذہب کوئی مسلمان کسی فرقے اور عقیدے کا کیوں نہ ہو انگریزی عملداری کا شاکی ہو نہیں سکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کی دیکھا دیکھی کھانے میں۔ پینے میں۔ پہننے میں۔ نشست برخاست میں چھوت بہت ماننے لگے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے تنزل کا جو کچھ سبب ہو۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر تو دیسی حالات نے بہت برا اثر کیا ہے۔ وہ شکی، ڈرپوک، پست حوصلہ، گھر گھسنے، آرام طلب ہو گئے۔

مسلمانوں کا عیب کہ انگریزوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور اس وجہ سے انگریزی عملداری کے بہت سے فائدوں سے محروم ہیں۔ اور یوماً فیوماً مفلس اور بے وقعت ہوتے جاتے ہیں اور گورنمنٹ کو اپنی طرف سے بدظن رکھتے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کی اتنی ہندو یت تو انشاءاللہ میں دفع کر دوں گا۔ مسلمانوں کا مذہب جدید العہد ہے۔ اور ابھی اس کی اصلیت دُوسرے مذہبوں کی طرح معدوم نہیں ہوئی۔ پس مجھ کو اپنی کوشش میں ہر طرح کامیابی کی اُمید ہے۔ میں جانتا ہوں نصیحت کا بڑا موثر پیرایہ نمونے کا دکھا دینا ہے۔ سو میں نے یہ باتیں مُنہ سے نہیں نکالیں جب تک کہ میں نے خود اس وضع کو اختیار نہیں کر لیا۔ جس کو میں چاہتا ہوں کہ سب مسلمان اختیار کریں۔ میں نے آپ سب صاحبوں کے ساتھ ایک میز پر کھانا کھایا اور آپ کے روبرو میں انگریزی لباس پہنے کھڑا ہوں اور میں یقیناً ویسا ہی مسلمان ہوں جیسا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ خود مسلمان جن کے مفاد کے لئے میں نے یہ وضع اختیار کی ہے۔ چھیڑ چھیڑ کر اور ہنس ہنس کر میری زندگی بر تنگ کر دیں گے۔ مگر ان کی چھیڑ جیسی ناچیز ہو گی ویسی ہی بے ثبات بھی ہو گی۔ تقاضائے وقت اور تعلیم دو میرے بڑے مددگار ہیں۔ اور ان کی تائید

سے مجھ کو پورا بھروسا ہے کہ بہت جلد ایک گروہ میری وضع کی تقلید کرے گا ۔ اب میں اپنی تقریر کو طوالت کی معذرت پر ختم کرتا ہوں ؛

۸ شعر کی اصلیّت اور اثر

(شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی)

مولانا شبلی ۱۸۵۷ء میں بمقام بندول ضلع اعظم گڈھ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر معقولات و منقولات کی تعلیم کے لئے رامپور، سہارنپور، لکھنؤ، لاہور وغیرہ مقامات کی سیاحت کرتے رہے۔ اُنیّس سال کی عمر میں یعنی ۱۸۷۶ء میں حجاز کا سفر کیا اور مدینہ منورہ کے کتب خانہ سے فیض اُٹھایا۔

۱۸۸۲ء میں آپ کی ملاقات سر سیّد احمد سے ہوئی۔ سر سید نے اس جوہر قابل کو پرکھا اور کالج میں فارسی و عربی کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ قیام علی گڈھ کے دوران میں آپ نے مصر و شام و روم کا سفر کیا۔ سر سیّد کے انتقال کے بعد ۱۸۹۸ء میں سولہ سال کی خدمت کے بعد کالج کی پروفیسری سے استعفاء دے دیا اور اعظم گڈھ میں مستقل قیام کر کے

تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد آپ حیدر آباد پہنچے۔ وہاں آپ کو نظامت علوم و فنون کا عہدہ مل گیا۔

۱۹۰۴ء میں مولانا شبلی لکھنؤ پہنچے اور ندوۃ العلماء کو اپنے انتظام میں لے لیا اور ۱۹۱۳ء تک نہایت خیر و خوبی کے ساتھ اسے چلاتے رہے۔ آپ نے اعظم گڈھ میں دارالمصنفین قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ قوم میں اچھے مصنفین کی ایک جماعت پیدا ہو۔ یہ ادارہ اب بھی قائم ہے اور علم و مذہب کی خدمت کر رہا ہے۔

مولانا شبلی کی شہرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۹۲ء میں سلطان ترکی نے تمغۂ مجیدی آپ کو عنایت کیا ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کا خطاب سرکار انگریزی نے دیا۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے۔ نظام دکن نے اول سو بعد ازاں تین سو روپیہ بطور وظیفہ مقرر کیا۔ انگلستان کے مشہور مستشرق پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات فارسی کی تصنیف کے سلسلے میں مولانا شبلی کی تصنیف شعر العجم سے مستفید ہونے پر فخر کیا ہے۔

آخر ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی نے وفات پائی۔

مولانا شبلی کی تصانیف حسب ذیل ہیں:-

۱- علم الکلام اور الکلام۔ دونوں کتابیں علم الکلام پر ہیں۔

۲- المامون۔ سیرۃ النعمان۔ الفاروق۔ الغزالی۔ سوانح مولانا روم

سیرۃ النبی - سفر نامہ - یہ آٹھ کتابیں تاریخی ہیں*

۳- موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم - یہ دونوں کتابیں تنقیدی ہیں*

۴- متفرق مضامین جو مقالات شبلی کے نام سے شائع ہوئے

شبلی کی جملہ تصنیفات میں عالمانہ استدلال و انداز پایا جاتا ہے - آپ کی تاریخی اور تنقیدی کتابوں کی بڑی خصوصیت تحقیق و استحکام رائے ہے۔ طرز ادا میں جدت کے ساتھ دل آویزی اور عام فہمی کا خیال رکھا گیا ہے - آپ کی زبان مستند ہے - طرز تحریر میں صفائی اور سادگی کے علاوہ ایک قسم کا زور ہے - تشبیہہ و استعارہ کی چاشنی بھی کہیں کہیں لطف پیدا کر دیتی ہے - آپ کا اسلوب بیان علمی اور تحقیقی ہے لیکن یہی اسلوب بیان ناول اور افسانہ کے لئے بھی اختیار کیا جا سکتا ہے*

واقعیت

فن ادب کا یہ ایک معرکتہ الآراء اور مغالطہ انگیز مسئلہ ہے - ایک فریق کا خیال ہے کہ واقعیت شعر کی ضروری شرط ہے - دوسرا گروہ کہتا ہے کہ محاسن شعری میں مبالغہ بھی ہے - اور ظاہر ہے کہ مبالغہ اور واقعیت متناقص چیزیں ہیں یہ مسئلہ مدت سے زیر بحث ہے اور فیصلہ اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ ہر فریق صرف اپنے دلائل

پیش کرتا ہے اور مخالف کا استدلال دھندلا کرکے دکھلاتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ دونوں طرف کے دلائل پورے زور کے ساتھ بیان کرکے انصافاً فیصلہ کیا جائے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ فریق بر سر غلط کو جو غلطی پیدا ہوئی ہے اس کے اسباب کیا ہیں *

مبالغہ کا طرفدار کہتا ہے کہ ائمۂ شعر نے تصریح کی ہے کہ کذب اور مبالغہ شاعری کا زیور ہے۔ نابغہ و بیانی سے لوگوں نے پوچھا کہ اشعر الناس کون ہے؟ اُس نے کہا من استجید کذبہ یعنی جس کا جھوٹ پسندیدہ ہو *

تمام بڑے بڑے شعراء جن کی شاعری مسلمۂ عام ہے ان کے کلام میں عموماً مبالغہ اور غلو موجود ہے۔ اس کے علاوہ اکثر وہی اشعار کارنامۂ شاعری خیال کئے جاتے ہیں۔ جن میں کذب اور مبالغہ ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض ائمۂ فن نے کذب اور مبالغہ کو حسنِ شاعری قرار دیا ہے لیکن زیادہ تر ائمۂ فن اس کے مخالف ہیں۔ حسان بن ثابت کہتے ہیں۔ کہ

"اچھا شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے۔ تو لوگ بول اٹھیں کہ سچ کہا"

جو شعراء بلاغت کے نکتہ شناس ہیں وہ ذرا طبیعت کی وجہ سے مبالغہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو ساتھ ہی کوئی شرط لگا دیتے

ہیں۔ جس سے مبالغہ نہیں رہتا *

شاعری اور انشاء پردازی تمدّن کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ یعنی جس قسم کا تمدّن ہوتا ہے۔ اُسی قسم کی شاعری بھی ہوتی ہے۔ قوم کی ابتدائی ترقی کا جو زمانہ ہوتا ہے۔ اس وقت شاعرانہ خیالات سادہ ہوتے ہیں۔ جب ترقی کرتی ہے اور تمام شریفانہ جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں تو گو شاعری میں جوش اور زور پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اب بھی سچائی اور راستی کے مرکز سے نہیں ہٹتی کیونکہ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب قوم ہمہ تن عمل ہوتی ہے۔ اس کے بعد جب عیش اور ناز و نعمت کی نوبت آتی ہے تو ہر ہر بات میں تکلّف۔ ساخت اور آورد پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی زمانہ ہے جب شاعری میں مبالغہ شروع ہوتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ قدمائے اوّلین کے کلام میں بالکل مبالغہ نہیں۔ جب عباسیہ کا دَور آیا اور عیش پرستی کی ہوا چلی تو مبالغہ کا زور ہوا *

اس تقریر سے یہ غرض ہے کہ جن شعراء کے کلام سے مبالغہ کی خوبی پر استدلال کیا جاتا ہے اُن کی نسبت یہ دیکھو کہ وہ کس زمانے کے ہیں۔ اگر متاخرین میں ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ تمدن کی خرابی ہے۔ جس کا اثر مذاق پر بھی پڑا ہے کہ لوگ مبالغہ کو پسند کر رہے ہیں اس لیے نہ شاعر سند کے قابل ہیں نہ پسند کرنے والوں

کے مذاق سے استدلال ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ تمدّن کی خرابی نے شاعر اور سامعین دونوں کے مذاق کو خراب کر دیا ہے ٭

جن لوگوں نے کذب اور مبالغہ کو شعر کا زیور قرار دیا ہے اُن کی غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ کذب و مبالغہ میں تخئیل کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اگر گھوڑے کی نسبت یہ کہا جائے کہ وہ ایک منٹ میں ایک کروڑ کوس طے کر لیتا ہے تو شعر بالکل بے مزہ اور مہمل ہوگا اس لئے جب کوئی شاعر اس قسم کا مبالغہ کرنا چاہے گا تو ضرور ہے کہ تخئیل سے کام لے۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے ؎

روبرو سے اگر آئینہ کے اس گلگوں کو
پھینک دے ٹیکے کبھی شرق سے تو غرب تلک
اتنے عرصہ میں پھر آئے تو اسے باور کر
عکس بھی آئینہ سے ہونے نہ پائے منفک

اس سے ظاہر ہوگا کہ مبالغہ میں اگر کوئی حسن پیدا ہوتا ہے تو تخئیل کی بناء پر ہوتا ہے نہ اس لئے کہ وہ جھوٹ اور مبالغہ ہے۔ بعض مبالغوں میں تخئیل کی بجائے اور کوئی شاعرانہ حسن ہوتا ہے ٭

اس بحث میں ایک بڑی غلطی یہ ہوتی ہے۔ کہ شاعری کی مختلف انواع اور اُن کے خصوصیات کا لحاظ

نہیں کیا جاتا۔ شعر کی دو قسمیں ہیں۔ تخئیلی اور غیر تخئیلی۔ تخئیل میں واقعے سے غرض نہیں ہوتی بلکہ زیادہ تر یہ مطمح نظر ہوتا ہے کہ قوتِ تخئیل کس قدر پُر زور اور وسیع ہے اس بنا پر اس قسم کی شاعری میں مبالغہ سے کام لیا جائے تو بد نما نہیں۔ لیکن وہاں بھی سامعین کی طبیعت پر استعجاب کا جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ مبالغہ کی وجہ سے نہیں بلکہ قوت تخئیل کی بنا پر ہوتا ہے۔ لیکن اور اقسام شاعری مثلاً فلسفیانہ۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ عشقیہ۔ نیچرل۔ ان میں مبالغہ بالکل لغو چیز ہے۔ اس لئے اگر شعر میں مبالغہ جائز بھی ہو تو صرف شعر کی ایک خاص نوع تخئیل میں ہوگا۔ اس سے عام خوبی نہیں ثابت ہوتی +

شاعری سے اگر فقط تفریحِ خاطر مقصود ہو تو مبالغہ کام آسکتا ہے۔ لیکن وہ شاعری جو ایک طاقت ہے جو قوموں کو زیرو زبر کر سکتی ہے۔ جو ملک میں ہلچل ڈال سکتی ہے۔ جس سے عرب قبائل میں آگ لگا دیتے تھے، جس سے نوحہ کے وقت در و دیوار سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ وہ واقعیت اور اصلیت سے خالی ہو۔ تو کچھ کام نہیں کر سکتی۔ تم نے تاریخ میں پڑھا ہوگا کہ جاہلیتہ میں ایک شعر ایک معمولی آدمی کو تمام عرب میں روشناس کر دیتا تھا۔ بخلاف اس کے ایران کے شعراء نے جن ممدوحوں کی تعریف میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دئے۔ ان

کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔ اس کی یہی وجہ ہے۔ کہ شعرائے جاہلیت کے کلام میں واقعیت ہوتی تھی۔ اس لئے اس کا واقعی اثر ہوتا تھا۔ ایرانی شعراء باتوں کے طوطے مینا بناتے تھے۔ جس سے دم بھر کی تفریح ہو سکتی تھی۔ باقی ہیچ *

یہ اثر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے۔ جب شعر میں واقعیت ہو۔ ورنہ خالی باتوں کی شعبدہ کاری سے کیا ہو سکتا ہے۔ عرب کی شاعری میں جو یہ اثر تھا کہ قبیلہ کے قبیلہ میں ایک شعر آگ لگا دیتا تھا۔ اسی وقت تک تھا۔ جب تک شاعری میں واقعیت تھی کہ جو کچھ کہتے تھے سچ ہوتا تھا۔ جب عباسیہ کے دور میں مبالغہ شروع ہو گیا تو شاعری ایک بانگ بے اثر رہ گئی۔ شعراء دیوان کے دیوان لکھ ڈالتے تھے اور کوئی خبر نہیں ہوتا تھا۔

یہ ضرور نہیں کہ شعر میں جو کچھ لکھا جائے وہ سرتاپا واقعیت ہو بلکہ غرض یہ ہے کہ اصلیت کے اثر سے خالی نہ ہو۔ مثلاً واقعہ واقع میں نہیں ہوا۔ لیکن شاعر کو اس کا پورا یقین ہے۔ یہ واقعہ شعر میں ادا ہوگا تو اثر سے خالی نہ ہوگا۔ میر انیس کہتے ہیں ؎

حملہ غضب ہے بازوئے شاہ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا

اس شعر میں بظاہر مبالغہ ہے۔ کسی انسان کے حملے

سے زمین اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتی۔ لیکن جب یہ تصور کیا جائے کہ یہ کلام کس کی زبان سے نکلا ہے تو کلام میں واقعیت کا اثر آ جاتا ہے۔ اور پھر مبالغہ نہیں رہتا دوسری صورت واقعیت کی یہ ہے کہ گو وہ واقعہ جس کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ اُس کی طرف یہ نسبت صحیح نہیں۔ لیکن فی نفسہ واقعہ ممکن ہے۔ اور پایا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں شعر کا اثر باطل نہیں ہوتا *

شعر میں مبالغہ پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہؤا کہ شاعر کا احساس عام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ قوی اور مشتعل ہوتا ہے۔ اس لئے ہر واقعہ اس پر اوروں کی بہ نسبت زیادہ اثر کرتا ہے۔ شاعر اسی اثر کو ادا کرتا ہے۔ لیکن چونکہ عام لوگ اس درجہ کا احساس نہیں رکھتے! اُن کو وہ مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ اور اب جو لوگ دراصل شاعر نہیں ہیں اور شاعر بننا چاہتے ہیں وہ بے تکلف مبالغہ شروع کرتے ہیں اور اصلی حد سے نکل جاتے ہیں *

قدماء اسی جائز حد تک مبالغہ کرتے تھے لیکن متاخرین نے جو دراصل فطرتاً شاعر نہ تھے۔ بقصد و ارادہ اپنے احساس کو قوی تر بنانا چاہا اور چونکہ اس کا اُن کو خود تجربہ نہ تھا۔ اس لئے کہیں سے کہیں نکل گئے۔ یہاں تک کہ جس قدر زیادہ ناممکن بات کا اظہار کیا جائے اسی قدر مبالغہ کا حسن سمجھا جانے لگا *

کلام کے لئے واقعیت ایسی ضروری چیز ہے کہ بلاغت کے بہت سے اسالیب میں صرف اسی وجہ سے حسن اور اثر پیدا ہوتا ہے کہ اس میں واقعیت کا پہلو ہوتا ہے۔

شعر کیوں اثر کرتا ہے

یہ امر بدیہی ہے کہ شعر ایک مؤثر چیز ہے لیکن یہ بحث طلب ہے کہ اس اثر کا اصلی سبب کیا ہے۔ ارسطو نے کتاب الشعر میں اس کی جو وجہ لکھی ہے اس کا حاصل یہ ہے:-

انسان میں نقالی اور محاکات کا فطری مادہ ہے۔ جانوروں میں یا تو یہ مادہ مطلق نہیں ہوتا۔ یا ہوتا ہے تو کم ہوتا ہے۔ مثلاً طوطی صرف آواز کی نقالی کر سکتا ہے۔ حرکات سکنات کی نقل نہیں کر سکتا۔ بندر حرکات۔ سکنات کی نقل اتارتا ہے لیکن آواز سے کام نہیں لے سکتا۔ بخلاف اس کے انسان آواز سے۔ اشارے سے۔ حرکات سے۔ سکنات سے اور مختلف طریقوں سے ہر چیز کی نقل اتار سکتا ہے۔ یہ بھی انسان کی فطرت ہے کہ اس کو محاکات میں ایک خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ فرض کرو ایک بدصورت جانور کی ہو بہو تصویر کھینچی جائے تو ہر شخص کو لطف آئے گا۔ حالانکہ خود اس جانور کے دیکھنے سے طبیعت مکدر ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شے

کی محاکات خود لطف انگیز ہے۔ فی نفسہ وہ چیز بُری ہو یا بھلی۔ چونکہ شعر بھی ایک قسم کی نقالی ہے۔ اور مصوری ہے۔ اس لئے خواہ مخواہ اس سے طبیعت پر اثر پڑتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ موسیقی اور راگ بالطبع مؤثر چیز ہے۔ اور شعر میں موسیقی کا جزو شامل ہے اس لئے جس شعر میں زیادہ موسیقیت ہوتی ہے زیادہ مؤثر ہوتا ہے +

ارسطو۔ نے جو وجوہ بیان کئے گو بجائے خود صحیح ہیں لیکن شعر کی تاثیر انہی باتوں پر نہیں۔ شعر میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ اس مضمون کے دل نشیں ہونے کے لئے پہلے یہ نکتہ سمجھنا چاہیے کہ انسانی معاشرت کی کل فلسفہ اور سائنس سے نہیں بلکہ جذبات سے چل رہی ہے۔ فرض کرو ایک بڈھے شخص کا بیٹا مر گیا ہے اور لاش سامنے پڑی ہے۔ یہ شخص اگر سائنس سے رائے لے تو یہ جواب ملے گا۔ کہ ایسے اسباب جمع ہو گئے جن کی وجہ سے دورانِ خون یا دل کی حرکت بند ہو گئی۔ اسی کا دوسرا نام مرنا ہے۔ یہ ایک مکانکی واقعہ ہے جو ناگزیر وقوع میں آیا۔ اور چونکہ دوبارہ زندہ ہونے کی کوئی تدبیر نہیں اس لئے رونا دھونا بے کار بلکہ ایک حماقت کا کام ہے۔ لیکن کیا تمام عالم میں ایک شخص

کا بھی اس پر عمل ہے؟ کیا خود سائنسداں اس اُصول سے کام لے سکتا ہے۔ بچوں کا پیار۔ ماں کی مامتا۔ محبت کا جوش۔ غم کا ہنگامہ۔ موت کا رنج۔ ولادت کی خوشی کیا۔ ان چیزوں کو سائنس سے کوئی تعلق ہے۔ لیکن یہ چیزیں اگر مٹ جائیں۔ دفعتہً سناٹا چھا جائے گا۔ ورنہ دُنیا قالب بے جان، شراب بے کیف، گل بے رنگ، گوہر بے آب ہو کر رہ جائے گی۔ دُنیا کی چہل پہل۔ رنگینی۔ دلآویزی۔ دلفریبی۔ سائنس کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ انسانی جذبات کی وجہ سے ہے۔ جو عقل کی حکومت سے قریباً آزاد ہے۔

شاعری کو جذبات ہی سے تعلق ہے۔ اس لئے تاثیر اس کا عنصر ہے۔ شاعری ہر قسم کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ اس لئے رنج۔ خوشی۔ جوش۔ استعجاب۔ حیرت میں جو اثر ہے۔ شعر میں بھی وہی اثر ہوتا ہے۔ مصورانہ شاعری اس لئے دل پر اثر کرتی ہے کہ جو مناظر اثر انگیز ہیں۔ شاعری اُن کو پیش نظر کر دیتی ہے۔

باد سحر کے جھونکے۔ آب رواں کی رفتار۔ پھولوں کی شگفتگی۔ غنچوں کا تبسم۔ سبزہ کی لہلہاہٹ۔ بادل کی پھوار۔ بجلی کی چمک۔ یہ منظر آنکھ کے سامنے ہو۔ تو دل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ شاعری ان مناظر کو بعینہ پیش کر دیتی ہے۔ اِس لئے اس کی تاثیر سے

کیونکر انکار ہو سکتا ہے ❖

شاعری صرف محسوسات کی تصویر نہیں کھینچتی۔ بلکہ جذبات و احساسات کو بھی پیش نظر کر دیتی ہے۔ اکثر ہم خود اپنے نازک اور پوشیدہ جذبات سے واقف نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو صرف دُھندلا دُھندلا سا نقش نظر آتا ہے۔ شاعری اِن پس پردہ چیزوں کو پیش نظر کر دیتی ہے۔ دُھندلی چیزیں چمک اٹھتی ہیں۔ مٹا ہوا نقش اُجاگر ہو جاتا ہے۔ کھوئی ہُوئی چیز ہاتھ آ جاتی ہے۔ خود ہماری روحانی تصویر جو کسی آئینہ کے ذریعے سے ہم نہیں دیکھ سکتے۔ شعر ہم کو دکھا دیتا ہے ❖

دُنیا کا کاروبار جس طرح چل رہا ہے اس کا اصلی فلسفہ خود غرضی اور اصول معاوضہ ہے اور جب اس کو زیادہ وسعت دی جائے تو ہمارے تمام اعمال اور افعال ایک سلسلۂ داد وستد بن جاتے ہیں۔ بچّوں کی محبّت اور پرداخت اس لئے ہے کہ وہ آئندہ چل کر ہمارے کام آئیں گے۔ باپ کی اطاعت اُس کے پچھلے احسانات کا معاوضہ ہے۔ مہمان نوازی اِس اصول پر ہے کہ ہم کو بھی کبھی مہمان ہونے کی ضرورت پیش آئے گی۔ قومی کام اس لئے کئے جاتے ہیں کہ بالواسطہ در واسطہ خود کرنے والے کو اِس سے فائدہ پہنچتا ہے ❖

اس فلسفے سے بے شبہ عمل کی قوّت بڑھ جاتی

ہے۔ تجارت کو ترقّی ہوتی ہے۔ کاروبار وسیع ہوتے ہیں۔ دولت کی بہتات ہو جاتی ہے۔ لیکن تمام جذبات مر جاتے ہیں دل مُردہ ہو جاتا ہے۔ لطیف اور نازک احساسات فنا ہو جاتے ہیں اور تمام دُنیا ایک بے حس کَل بن جاتی ہے جو خود غرضی کی قوّت سے چل رہی ہے۔ اس حالت میں شعر شریفانہ جذبات کو ترو تازہ کرتا ہے۔ وہ محسوسات کے دائرہ سے نکال کر ہم کو ایک اور وسیع اور دلفریب عالم میں لے جاتا ہے اور ہم کو بے لاگ اور بے غرض دوستی کی تعلیم کرتا ہے۔ وہ ہم کو سچّی خوشی اور سچّی مسرّت دلاتا ہے جبکہ کاروبار کے ہجوم مقابلہ کی کشمکش معاملات کی اُلجھن تردّدات کی داروگیر سے دل بالکل ہمّت ہار دیتا ہے تو شعر مجسّم سکون اور اطمینان بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

جبکہ سائنس اور مشاہدات کی ممارست ہم کو سخت دل اور کٹّر بنا دیتی ہے اور تمام معتقدات اور مسلمات عامہ کی دل میں حقارت پیدا ہو جاتی ہے کسی بات پر اعتبار نہیں آتا۔ کسی چیز کا اثر نہیں رہتا۔ مادہ کے سِوا تمام چیزوں کی حکومت دل سے اُٹھ جاتی ہے اس وقت شاعری ہمارے دل کو رقیق اور نرم کرتی ہے۔ جس سے تسلیم۔ اثر پذیری اور اعتقاد پیدا ہوتا

ہے۔ مادیت کے بجائے روحانیت قائم ہوتی ہے۔ وہ ہم کو عالم تخیل میں لے جاتی ہے۔ جہاں تھوڑی دیر کے لئے مشاہدات کی بے رحم حکومت سے ہم کو نجات مل جاتی ہے۔

شاعری کا استعمال

شعر ایک قوت ہے۔ جس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کا استعمال صحیح طور پر کیا جائے عرب میں شاعری کی ابتدا رجز سے ہوئی ہے۔ یعنی میدان جنگ میں دو حریف جب مقابلہ کے لئے بڑھتے تھے تو جوش میں فخریہ موزوں فقرے ان کی زبان سے نکلتے تھے۔ یہ دو چار شعر سے زیادہ نہیں ہوتے تھے۔ لیکن طبل جنگ کا کام دیتے تھے۔ اس کے بعد مرثیہ شروع ہوا۔ یعنی جب کوئی عزیز یا دوست مر جاتا تھا تو اس کی لاش پر نوحہ کرتے تھے۔ بعض بعض شعرا نے تمام عمر مرثیہ کے سوائے کچھ نہ کہا۔ خنساء ایک عورت تھی۔ وہ اپنے بھائی سے نہایت محبت رکھتی تھی۔ وہ مر گیا تو اس کو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام عمر رویا کی۔ چنانچہ اس کے سینکڑوں ہزاروں اشعار اس کے مرثیے میں ہیں۔ تمیم بن نویرہ کا بھی بھائی کے مرنے پر یہی حال ہوا۔ شہر شہر مارا پھرتا تھا۔ جہاں پہنچ جاتا، مرد عورت اس کے پاس جمع ہو جاتے۔ بھائی کا مرثیہ پڑھتا۔ خود روتا

اور لوگوں کو رُلاتا ۔

مرثیہ کے بعد قصیدہ شروع ہوا۔ شعرائے عرب اکثر صاحب تیغ و علم ہوتے اس لیئے قصائد میں اپنے معرکہ لکھتے تھے۔ عمرو بن ہند عرب کا مشہور بادشاہ گذرا ہے۔ جب اس کا تسلط تمام ملک پر ہو گیا تو اُس نے ایک دن دربار میں کہا کہ عرب میں آج کوئی ہے جو میرے سامنے گردن نہ جھکائے۔ درباریوں نے کہا۔ عمرو کلثوم شاعر اگر آپ کا مطیع ہو جائے تو پھر کوئی شخص آپ کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتا۔ بادشاہ نے عمرو کلثوم کو مع مستورات کے بُلا بھیجا۔ عمرو کلثوم کی ماں شاہی حرم میں گئی اور وہ خود دربار میں بیٹھا۔ بادشاہ کی ماں نے عمرو کلثوم کی ماں سے کسی چیز کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اُٹھا دینا۔ اُس نے کہا کہ تم خود اُٹھا لو۔ بادشاہ کی ماں نے دوبارہ کہا اور پھر یہی جواب ملا۔ تیسری دفعہ جب فرمائش کی تو عمرو کلثوم کی ماں چیخ اٹھی واتغلباہ (یعنی قبیلہ تغلب کی دہائی) عمرو کلثوم نے آواز سُنی ۔ سمجھا کہ اُس کی ماں کی تحقیر کی گئی ہے۔ فوراً تلوار میان سے گھسیٹ بادشاہ کا سر اڑا دیا۔ اور دربار سے نکل آیا اور پھر بڑا رن پڑا۔ جس میں دونوں طرف کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ عکاظ کے میلے کا دن آیا تو عمرو کلثوم نے مجمع عام پر کھڑے ہو کر قصیدہ پڑھا جس

میں اس واقعے کی تفصیل تھی۔ اس قصیدے میں تمام واقعات اور اپنی حمیت و غیرت کو اس جوش سے لکھا ہے کہ دو سو برس تک قبیلہ تغلب کا ہر بچہ اس کے اشعار بچپن ہی سے سیکھتا اور یاد کرتا تھا۔ اہل تاریخ کا بیان ہے کہ اس قصیدے کی بدولت کئی سو برس تک اس قبیلہ میں شجاعت اور دلیری کے اوصاف قائم رہے اب بھی یہ اشعار افسردہ دلوں کو گرما دیتے ہیں۔ یہ قصیدہ درِ کعبہ پر آویزاں کیا گیا تھا۔ اور اس وجہ سے سبعہ معلقہ میں داخل ہے ؛

یہ شاعری کا صحیح استعمال تھا اور اسی کا اثر تھا کہ عرب میں قوم کی باگ شعرا کے ہاتھ میں تھی۔ وہ قوم کو جدھر چاہتے تھے جھونک دیتے تھے۔ اور جدھر سے چاہتے تھے روک لیتے تھے۔ افسوس ہے کہ ایران نے کبھی یہ خواب نہیں دیکھا۔ یہاں کے شعرا ابتدا سے غلامی میں پلے اور ہمیشہ غلام رہے اور وہ اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے پیدا ہوئے تھے ؛

شریفانہ اخلاق پیدا کرنے کا شاعری سے بہتر کوئی آلہ نہیں ہو سکتا۔ علم اخلاق ایک مستقل فن ہے اور فلسفہ کا ایک جزوِ اعظیم ہے۔ ہر زبان میں اس فن پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اخلاقی تعلیم کے لئے ایک ایک شعر ایک ضخیم کتاب سے زیادہ کام دے

سکتا ہے۔ شاعری ایک مؤثر چیز ہے۔ اس لئے جو خیال اس کے ذریعے سے ادا کیا جاتا ہے۔ دِل میں اُتر جاتا ہے اور جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔ اس بنا پر اگر شاعری کے ذریعے سے اخلاقی مضامین بیان کئے جائیں اور شریفانہ جذبات مثلاً شجاعت۔ ہمّت۔ غیرت۔ حمیت اور آزادی کو اشعار کے ذریعے سے اُبھارا جائے تو کوئی اور طریقہ اُس کی برابری نہیں کر سکتا۔ اسلام سے پہلے عرب ایک سخت جاہل اور مفلس قوم تھی۔ گائے اور اونٹنی کے دُودھ کے سوا اور کچھ ان کو میسّر نہیں آ سکتا تھا۔ مکان کے بدلے جھونپڑے یا کمبل کے تنبو تھے۔ رات دن آپس میں لڑتے اور کٹتے مرتے تھے۔ باایں‌ہمہ انہی وحشیوں میں سچائی۔ ایفائے عہد۔ مہمان نوازی۔ جود و سخا۔ ہمت و غیرت کے جو اوصاف پائے جاتے تھے۔ آج شائستہ قوموں کو نصیب نہیں ◆

۹۔ گھر کی تربیت

(شمس العلما خان بہادر ذکا اللہ دہلوی)

مولوی ذکاء اللہ خاں ۱۸۳۲ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے اور تعلیم سے فارغ ہو کر اسی کالج میں معلم ریاضی مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد آگرہ کالج میں معلم اردو ہوئے اور پھر ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو کر اضلاع بلند شہر و مراد آباد میں رہے۔ ۱۸۶۹ء میں آپ میور کالج الہ آباد میں عربی و فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے پندرہ سال تک آپ نے اس کالج میں ایم۔ اے تک کی کلاسوں کو عربی و فارسی پڑھائی۔ آخر ۴۲ سال کی سرکاری ملازمت کے بعد آپ نے پنشن لی اور چوبیس سال تک بفراغت تمام تصنیف و تالیف میں منہمک رہے۔ اور ۱۹۱۰ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔

مولوی ذکاء اللہ نے اُردو زبان کی جو خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ہمیشہ قابلِ تحسین و تشکر رہیں گی۔ ریاضیات۔ تاریخ و جغرافیہ۔ علم ادب۔ علم اخلاق۔ طبعیات۔ و ہیئت اور سیاست مدن وغیرہ علوم پر آپ کی تصانیف کی تعداد ۱۴۲ تک پہنچتی ہے۔ ان مستقل تصانیف کے علاوہ وقتاً فوقتاً مختلف موضوعوں پر مضامین لکھتے رہتے تھے جو مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ اگر ان تمام مضامین کو یکجا کیا جائے تو یہ مجموعہ کئی ضخیم جلدوں کا تیار ہوگا۔ ان مضامین میں تاریخ۔ فلسفہ سائنس۔ کیمیا۔ طرزِ معاشرت۔ علم معیشت۔ سیاست غرض مشکل سے کوئی مضمون بچا ہوگا جس پر آپ نے طبع آزمائی نہ فرمائی ہو۔ کثرت تصانیف کے لحاظ سے اُردو کا کوئی مصنّف آپ کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کی تصانیف ملک میں بہت مقبول ہوئیں۔ گورنمنٹ نے بھی حُسنِ خدمات کے صلے میں خان بہادر اور شمس العلماء کے خطابات عطا فرمائے اور پندرہ سو روپیہ کا ایک انعام بھی دیا۔

مولوی ذکا اللہ کا طرزِ تحریر سلیس۔ رواں اور بے تکلف ہے۔ بڑے سے بڑے حال کو نہایت مختصر عبارت میں لکھ دیتے ہیں۔ اور مشکل سے مشکل بات کو چند الفاظ میں سُلجھا دیتے ہیں۔ لیکن آپ کا اسلوب کسی قدر روکھا پھیکا ہے۔ اس میں شگفتگی اور دل کشی نہیں۔

گھر ہی میں آدمی اخلاق کی تعلیم پاتا ہے۔ بُری خواہ بھلی۔ گھر ہی میں چال چلن کے وہ اصول سیکھتا ہے۔ جو اس کے ساتھ ساری عمر رہتے ہیں۔ جوانی اور پیری میں وہ انہی پر چلتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی خصلت کی برائی کی تعلیم گاہ گھر ہے۔ مشہور ہے کہ اوضاع و اطوار آدمی میں آدمیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ آدمی میں آدمیت اُس کا دماغ پیدا کرتا ہے۔ مگر ان دونوں باتوں سے زیادہ سچ بات یہ ہے کہ آدمی میں آدمیت گھر پیدا کرتا ہے۔ گھر میں آدمی کا دل کشادہ زیادہ تر ہوتا ہے۔ وہ ساری عادتیں یہیں پیدا کرتا ہے۔ وہیں اُس کی عقل پیدا ہوتی ہے۔ گھر ہی کی ٹکسال میں خصلت کے کھوٹے کھرے سکّے ڈھلے جاتے ہیں۔ گھر ہی سے وہ اصول و مسائل پیدا ہوتے ہیں جو معاشرت انسانی پر حکومت کرتے ہیں۔ گھر ہی کی باتوں کا عکس قانون ہوتا ہے۔ ننھے بچّوں کی وہی ننھی ننھی رائیں بڑے ہونے پر جمہور انام کا دستور العمل بنتی ہیں ◆

آدمی جب دُنیا میں پیدا ہوتا ہے تو وہ نہایت ہی بے کس اور بے بس ہوتا ہے۔ اُس کی کل پرورش و تربیت و تعلیم ان آدمیوں کے ذمّے ہے جو اُس کے آس پاس ہوتے ہیں۔ جس وقت سے وہ سانس

لینے لگتا ہے۔ اس کی تعلیم شروع ہوتی ہے۔ ابتدا میں بچے کی تعلیم اِس طرح ہوتی ہے کہ وہ جو دیکھتا ہے اس کی نقل اتارتا ہے۔ عربی ضرب المثل ہے کہ انجیر کے درخت کو دیکھ کر انجیر کا درخت زیادہ پھل لاتا ہے۔ اور ہماری مثل ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ بس یہی بچوں کا حال ہے۔ کہ وہ مثال کی تقلید سے تعلیم پاتے ہیں۔ بڑی معلمہ مثال ہے۔ "بچپنے کی خصلت آدمی کی خصلت کا مغز ہوتا ہے" باقی اور تعلیم بالائی پوست ہے جس کے اندر وہ مغز ہمیشہ رہتا ہے۔ ایک شاعر کا قول کیا ہی سچا ہے کہ جس طرح صُبح دِن کو دکھاتی ہے ایسے ہی بچہ آدمی کا حال تبلاتا ہے۔ مثل مشہور ہے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ جو باتیں ولادت کے وقت ہماری طبیعت میں نفوذ کرتی ہیں وہی دیرپا اور ہمارے چال چلن کی محرک ہوتی ہیں۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ ایک نئے عالم کی چوکھٹ پر قدم رکھتا ہے۔ ہر چیز کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے پھر رفتہ رفتہ وہ چیزوں کو غور کی نظر سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اشیاء کا باہم مقابلہ کرتا ہے۔ اِن کے تصورات کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہے۔ ایک فاضل نے لکھا ہے کہ اٹھارہ اند بیس مہینے کی عمر کے درمیان اس کو مادی اشیاء اپنے

قولئے خواص اجسام اور اپنے اور دوسروں کی فہم کا اتنا علم حاصل ہو جاتا ہے کہ باقی ساری عمر میں اس قدر نہیں ہوتا۔ اس عمر میں علم کا خزانہ جو جمع ہوتا ہے اور اُس کے دماغ میں جو خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ایسے ضروری ہوتے ہیں کہ وہ اگر کسی طرح ملیامیٹ ہو جائیں تو پھر اس کو ایک ہفتہ جینا محال ہو جاتا ہے ٭

یہ بچپن ہی کی کیفیت ہے کہ "دل لوح سادہ برائے نقش آمادہ" جو چنگاری اس میں پڑتی ہے۔ وہ روشنی دکھاتی ہے۔ خیالات جلد ذہن میں آ جاتے ہیں اور دیر تک قائم رہتے ہیں۔ بچپن میں جو باتیں ساتھ ہوتی ہیں وہ اکثر آخیر عمر تک ساتھ رہتی ہیں۔ بچپنا ہی میں خصلت کی تعلیم کی ترقی ہو جاتی ہے یعنی مزاج کی۔ ارادے کی۔ عادت کی۔ جن پر آئندہ ساری عمر کی خوشحالی بہت کچھ منحصر ہے۔ اگر کوئی عالی دماغ حکیم روزانہ بے آرامیوں اور بد اخلاقیوں اور کمینہ پن کی حالتوں میں پھنسا تو وہ خود بخود وحشی پن کی طرف کھنچا چلا جائے گا۔ پس جب عاقلوں کی یہ نوبت ہے۔ تو بچے کا کیا حال ہوگا۔ جو بے کس ہے اور موم کی طرح بہت آسانی سے نقش قبول کرنے کی قابلیت رکھتا ہے ٭

جس گھر میں محبت کا اور ادائے حقوق۔ شرافت کا شوق غالب ہے۔ جس میں دل و دماغ دونوں عاقلانہ حکم

چلاتے ہیں۔ جس میں روز مرّہ کے کار و بار زندگی میں دیانت۔ امانت۔ راستی موجود ہے۔ جس میں عاقلانہ و مشفقانہ انتظام موجود ہے۔ اُس گھر میں یہ توقع ہو سکتی ہے کہ اولاد تندرست و خوشدل نفع رساں ایسی پیدا ہو کہ جب اس کو قوّت اپنے مربیوں کے قدم بقدم چلنے کی حاصل ہو۔ وہ نیک دلی کے طریقوں پر چلنے اور اپنے نفس پر ضابط ہو اور اپنے ہمسائے کے آدمیوں کی بہبودی اور رفاہ عام میں معاون ہو۔ بچے کی طبیعت کے ڈھالنے کے لئے سب سے عمدہ سانچہ نمونہ ہے۔ اگر کوئی چاہے کہ میرے بچّوں کی خصلتیں اچھّی ہوں۔ تو اُن کے سامنے اپنی خصلت کے اچھّے نمونے پیش کرے۔

ہر بچّے کی آنکھوں کے سامنے جو نمونہ مستقل طور پر رہتا ہے۔ وہ اُس کی ماں ہے۔ سو معلموں کے برابر ایک اچھی ماں ہوتی ہے۔ گھر میں وہ دلوں اور ساری آنکھوں کی مقناطیس ہوتی ہے۔ اولاد ہمیشہ ماں کی پیرو ہوتی ہے۔ مثال۔ تعلیم با العمل کو کہتے ہیں۔ امر زبانی حکم کو۔ مثال اپنی بے زبانی سے تعلیم کرتی ہے۔ وہ زبانی اوامر نہیں کرتے۔ مثال بد کے رُو برُو عُمدہ اوامر بہت ہی کم فائدہ دیتے ہیں۔ مثال کی پیروی کی جاتی ہے۔ اوامر کی نہیں۔ جب اوامر برخلاف

امر کے ہوگا تو وہ بزدلانہ برائیاں سکھائے گا۔ بچّے بھی اپنے ماں باپ کی اس بات کو سمجھ جاتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کچھ اور کرتے ہیں کچھ اور۔ اگر کوئی واعظ کسی کا مال مار کر جیب میں رکھے اور دیانت کا واعظ کہے۔ تو کچھ اثر نہ ہوگا۔ گھر عورت کی دارالسلطنت ہوتا ہے اس میں سارے احکام اس کے چلتے ہیں وہ اپنے بچّوں کی ننھی ننھّی رعیت پر حکم ناطق نافذ کرتی ہے۔ ہر چیز کے لئے بچّے اپنی آنکھوں کو اُس کی طرف لگائے رہتے ہیں۔ ہر وقت اُن کی روبرو ہی مثال اور نمونہ ہے۔ جس کی وہ پیروی کرتے ہیں اور نقل اتارتے ہیں۔ گو اس کا علم خود ان کو نہ ہوتا ہو۔ اس واسطے بچّوں کی چال چلن اور طور طریقے پر ماں کا اثر بہ نسبت باپ کے زیادہ ہوتا ہے۔ گھر میں ماں کا نیک مثال ہونا ایک بڑی نعمت ہے*

ابتدائے عمر میں دل کے اندر جو خیالات جم جاتے ہیں۔ ان کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے کہ کسی چھوٹے پودے کی چھال پر حروف کندہ کر دئے جائیں۔ وہ درخت کے ساتھ بڑھتے چلے جائیں گے۔ گو وہ کیسے ہی ہلکے ہوں۔ مگر وہ مٹنے کے نہیں۔ زمین پر بیج ڈالے جاتے ہیں تو کچھ مدّت وہ اس میں پڑے رہتے ہیں۔ پھر پھوٹتے ہیں اور بڑھتے ہیں۔ کہ آخر کو وہی ہمارے

عادات اور اعمال ہو جاتے ہیں۔ نسل انسانی کا ظاہری انتظام مہر مادری پر ہے۔ جس کا اثر مُدام اور عالم گیر ہے۔ جب سے انسان پیدا ہوتا ہے۔ اُس کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور اُس کے ساتھ ہی ماں کی محبت کا اثر شروع ہوتا ہے۔ بچّوں پر نیک ماؤں کا اثر عمر بھر رہتا ہے۔ جب اولاد دنیا کے کام دھندوں۔ جھگڑوں بکھیڑوں اور تردّدات۔ تفکرات میں پڑتی ہے اور تکلیفات اور مشکلات پیش آتی ہیں تو وہ صلاح و مشورے اور تسلّی و تشفی کے لیۓ ماں ہی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ مصیبت کے وقت ماں ہی یاد آتی ہے۔ مائیں اپنے بچوں کے دلوں میں جو عمدہ اور پاکیزہ خیالات جما دیتی ہیں۔ وہی بڑے ہونے پر نیک اعمال کی صورت میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں ٭

عورت سب معلموں سے زیادہ نرمی اور ملائمت سے تعلیم کرتی ہے۔ مرد انسانیت کا دماغ ہے۔ عورت اس کا دل ہے۔ اس کی قوت ہے۔ یہ اس کا حُسن و زیب و زینت ہے۔ مرد عقلی ہدایتیں کرتا ہے مگر عورت قلب کی درستی کرتی ہے۔ جس سے خصلت سنورتی ہے۔ مرد حافظے کو پُر کرتا ہے۔ عورت دل کو پُر کرتی ہے۔ مرد جس بات کا یقین دلاتا ہے۔ عورت اس کی محبت دلاتی ہے۔ غرض عورت کی بدولت اکثر

ہماری رسائی نیکی پر ہوتی ہے ۔

اگر کوئی عورت نیک اطوار۔ کفایت شعار۔ خوش مزاج ۔ پاکیزہ طبیعت ۔ کسی گھر کی سرپرست ہو تو سارے کنبے کی زندگی بخیر و عافیت بسر ہو گی ۔ اور وہاں آرام و چین ۔ نیکی و خوشدلی ۔ طرح طرح سے اپنے جلوے دکھائے گی ۔ اور وہاں مرد کے لئے بہشت سے ہمراہی دل کے خوش کرنے والے موجود ہوں گے ۔ دلوں کے لئے عبادت گاہ وہاں تیار ہے ۔ حادثات زمانہ سے بچنے کے لئے مامن وہ ہے ۔ محنت و مشقت کے بعد آرام گاہ ہے ۔ مصیبت و افلاس میں تسلّی و تشفی وہاں ہے ۔ غرض ہر درد کی دوا وہاں موجود ہے ۔ اور ہر وقت خوشی اور راحت کا سامان مہیا ہے بچوّں اور بڑوں کی تربیت اخلاق میں گھر سب مدرسوں سے بہتر ہے ۔ ویسا ہی بدتر بھی ہو سکتا ہے ۔ گھر میں اس قوت کا ہونا بھی ممکن ہے ۔ جو بچپن سے لے کر دم آخیر تک بے حد شرارت اور جہالت پیدا کرتی ہے ۔ ماؤں اور دائیوں کی نالائقی سے کیا کیا اخلاقی آفات اور امراض ظہور میں آتے ہیں ۔ بچےّ کو ایک پاجی ۔ جاہل دایہ کے حوالے کر دو ۔ تو بچےّ میں وہ عیب پیدا ہو گا جو ساری عمر کی تقلید و تربیت سے دُور نہ ہو گا ۔ جس گھر میں ماں شریر ۔ کاہل ۔ نابکار

ہو۔ اکھڑ بچپن نکالتی ہو۔ جھنجھلاتی ہو۔ رنج پھیلاتی ہو وہ گھر جہنم ہے۔ جس سے بھاگنے کو دل چاہتا ہے۔ جن بچوّں کی بد نصیبی سے ایسے گھروں میں پرورش ہوتی ہے۔ وہ اخلاق کی رو سے بونے اور بے ڈول ہوں گے۔ وہ نہ اپنے لئے اچھے ہوں گے اور نہ اوروں کے لئے۔ بلکہ سب کے واسطے بڑے ہوں گے۔ مردوں کی خصلت بنانے میں عورتیں جو اثر کرتی ہیں گو نوشت خواند میں نہ آئے مگر وہ اُن کے بعد باقی رہتا ہے اور ہمیشہ اپنے نتائجُ خیر کو جاری رکھتا ہے۔ عورتوں نے نہ تو بڑھ بڑھ کے تصویریں بنائیں نہ بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں۔ نہ الجبرا ایجاد کیا۔ نہ دُوربین اور دُخانی کلیں اختراع کی ہیں۔ بلکہ صاف باطن و نیک صفات۔ اہل دل موجدوں کو اپنی گود میں تعلیم و تربیت کیا ہے۔ اس سے بہتر کیا ایجاد دُنیا میں ہو سکتا ہے۔ اگر عورت اور مرد دونوں کی خصلتوں کا فیصلہ اس لحاظ سے کیا جائے کہ کس نے زیادہ بھلائی دُنیا میں پھیلائی تو عورتوں کو ترجیح رہے گی ؛

عورتوں کو لازم ہے کہ وہ سلیقہ مندی کی عادت پیدا کریں کہ جس سے وہ دُنیا کے روزانہ کاموں میں موثر۔ مددگار۔ معاون ہوں۔ عورتیں ہی بچوّں کو دُودھ

پلانے والی - پرورش کرنے والی - تعلیم کرنے والی ہوتی ہیں - ماؤں کی فقط محبت - طبعی کافی نہیں - عقل حیوانی نسل حیوانات کو قائم رکھتی ہے - کیونکہ اس کو ضرورت تربیت و تعلیم کی نہیں ہوتی - لیکن عقل انسانی - جس کی ضرورت ہمیشہ کنبے میں رہتی ہے - تعلیم کی محتاج ہے - خدائے تعالیٰ نے عورتوں کو ایک خاص فطرت جسمانی عطا کی ہے - لیکن اس کے ساتھ فطرت عقلی اور فطرت اخلاقی بھی سکونت پذیر ہے - پس عورتوں کو سب سے پہلے یہ سمجھنا ضرور ہے کہ صحت جسمانی و صحت عقلی و صحت اخلاقی بموجب قوانین فطرت گھر میں کیونکر حاصل ہو سکتی ہے +

آدمی کے ایک تہائی بچے پانچ سال کی عمر کے اندر مر جاتے ہیں - اس کا سبب یہ ہے کہ مائیں قوانین فطرت سے آگاہ نہیں ہوتیں - وہ جسم کی ترکیب سے بے خبر ہیں - تازی ہوا اور صاف پانی کے فوائد سے ناواقف ہیں - زود ہضم غذا کے تیار کرنے اور کھانے کو نہیں سمجھتیں - یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ عورتوں کو مردوں جیسی عقل اس لئے دی گئی ہے کہ وہ کام میں لائی جائے - نہ یہ کہ نکمی رکھ کر ہٹرائی جائے - یہ عطیات بغیر کسی مطلب اور مقتضا کے نہیں عطا ہوئے +

عورت اس لئے نہیں بنائی گئی ہے کہ وہ بے

عقل اور نا فہم رہ کر مرد کی خدمت یا مزدوری کرے یا ایک سُہانا کھلونا بن کر بوقت فرصت اس کا دِل خوش کرے۔ اِس کے ذِمّے ایسے نازک جواب دِہی کے فرائض ہیں کہ جن کے لیئے دماغ۔ تعلیم یافتہ اور دل شفقت آمیز چاہیئے۔ عورتوں کی تعلیم کے باب میں ہمیشہ سے اِختلاف رائے چلا آتا ہے کہ ایک طرف نہایت تنگ دلی سے یہ رائے نامعقول۔ بے ہودہ۔ پیش کی جاتی ہے کہ عورتوں کو علم کیمسٹری کا اتنا آنا کافی ہے کہ ہنڈیا پکا لیں اور علم جغرافیہ اتنا بہت ہے کہ وہ اپنے گھر کے کمرے کو جانتی ہو۔ بڑا کتب خانہ اُن کے لیئے یہ ہے کہ ایک کتاب مقدس ان کے پاس ہو۔ دوسری طرف اس کے مخالف وہ رائے ہے۔ کہ جس میں مبالغہ۔ لغو۔ فضول۔ فطرت کی مخالفت موجود ہے۔ اُس کا دعوےٰ یہ ہے کہ تعلیم میں عورت اور مرد دونوں ہم پلّہ ہوں۔ حقوق میں اور رائے دینے میں دونوں برابر ہوں۔ منصب اور جاہ و دولت و حکومت کے لیئے جو خود غرضی کی جڑ اور خطرے کا گھر ہیں دونوں مساوی سمجھے جائیں۔ فقط عورت ہونے کی وجہ سے کسی منصب سے محرومی نہ ہو +

ابتدائے عمر میں جو تعلیم و تادیب نہایت مناسب لڑکوں کے واسطے ہے وہی لڑکیوں کے لیئے ہے۔ تربیت

و تعلیم کی استعداد جیسی مردوں میں ہے ویسی ہی عورتوں میں ہے۔ مردوں کی اعلیٰ درجے کی تعلیم کے حق میں جو دلائل متین اور براہین عظیم بیان کیے جاتے ہیں وہی عورتوں کی اعلیٰ درجے کی تعلیم کے لیے نہایت متانت سے وکالت کر رہے ہیں۔ گھر کے تمام کارخانوں میں عقلمندی عورتوں کی بکار آمد اور مؤثر ہونے کو زیادہ کرے گی۔ یہ عقلمندی۔ عورتوں میں تفکر اور مآل اندیشی پیدا کرے گی۔ وہ پہلے سے اُن کو سمجھا دے گی کہ زندگی کی ضروریات کیا ہیں اور کیونکر بہم پہنچ سکتی ہیں۔ غرض ہر طرح سے اُن کی تقویت کا سبب ہو گی۔ ان کے قوائے عقلیہ کی تادیب سے یہ فائدہ حاصل ہوگا کہ وہ جیسے اپنے بھولے پن اور جہالت سے دغا اور فریب اور توہمات کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ نہ پھنسیں گی۔ اور اخلاقی اور مذہبی تربیت اُن کا افتخار بڑھائے گی۔ اور ان میں وہ سچی "خود اعتمادی" اور فرائض پروری پیدا کرے گی۔ جو خانہ داری کے چین و آرام کا اور خوش دِلی کا سرچشمہ ہے۔

مردوں کے اخلاق اور دماغ کا صحیح رہنما عورتوں پر موقوف ہے۔ اس لیے عورتوں کی تعلیم ایک قومی اور مہتم بالشان امر سمجھا جاتا ہے۔ عورتوں کی پاکیزگی اخلاق اور عقلی تربیتا۔ مردوں کی اخلاقی خصلت ذاتی

عقلی قوت کی بڑی ملاذ و ماوے ہیں۔ جیسے یہ دونوں مل کر اپنے قوے کو کامل طور پر ظاہر کریں گے۔ ویسا ہی قوم کا اِنتظام زیادہ عمدہ ہوگا۔ اور اس کی برتری اور اقبال مندی یقینی ہوگی +

:(*)(*)(*):

۱۰۔ مظلوم کی فریاد

(مصورِ غم علامہ راشد الخیری دہلوی)

مولانا راشد الخیری شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی بیوی کے بھتیجے اور دلّی کے ایک معزز و عالی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر کے افراد سے حاصل کرنے کے بعد عربک اسکول میں داخل ہوئے اور انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۹۰۸ء میں آپ نے عورتوں کے لئے ماہنامہ "عصمت" جاری کیا جو اب تک خواتین ہند کی فلاح و بہبود میں مصروف ہے۔

مولانا کی مشہور تصانیف میں "صبح زندگی" اور "شام زندگی" کو جو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے جن میں زیادہ تر ناول ہیں۔ جن کا تعلق مستورات کی اصلاح سے ہے۔

افسوس کہ یہ زبردست انشا پرداز۔ ناول نگار اور عورتوں کا ہمدرد اور مونس و غمگسار ۲۔ فروری ۱۹۳۶ء کو اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گیا +

مولانا مرحوم نے ابتدأ تحریر میں مولوی نذیر احمد کی پیروی اختیار کی تھی۔ لیکن کچھ مدّت بعد اُن کا اپنا رنگ اُبھر آیا۔ آپ کی زبان خاص دہلی کی اردوئے معلیٰ ہے۔ آپ کا روز مرّہ عہد حاضرہ کے انگریزی اثر سے قطعی پاک اور ٹھیٹ ٹکسالی ہے۔ عورتوں کی زبان اور بیگمات کے محاوروں پر عبور حاصل ہے۔ اور ان کو نہایت لُطف کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ الفاظ ملائم اور شیریں۔ زبان سادہ اور شگفتہ۔ طرز بیان ایسا۔ جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔ آپ حزن و ملال کے بادشاہ ہیں۔ ہر تصنیف میں بے کسی کے مرقعے اور یاس کی تصویریں موجود ہوتی ہیں۔ غم و الم کے مناظر کو الفاظ میں جس طرح آپ نے بیان کیا ہے وہ آپ ہی کا حِصّہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک ادب میں آپ کا لقب "مصوّر غم" مشہور ہے +

آپ کے ناول ایک مخصوص و محدود طبقے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ناولوں کے اشخاص اور واقعات اور طرز ادا میں طبیعت کو اکتا دینے والی یکسانیت و یک رنگی ہے۔ علاوہ ازیں حزن و ملال کے غلبے کی وجہ سے بھی طبیعت پراگندہ اور مُضمحل ہو کر رہ جاتی ہے۔

آپ کا اسلوب مظلومیت اور بے بسی کی مرقع کشی کے لیۓ نہایت موزوں ہے۔ یہ مُرقعے اگر دو چار ہوں تو کیا کہنا۔ لیکن تعداد کے بڑھنے پر تنوع کا خون ہو کر تصنع اور آورد کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

قفس میں مجھ سے رُو دادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گِری تھی جس پہ کل بجلی وُہ میرا آشیاں کیوں ہو

مرزا غالب کا یہ شعر مشکل ہو یا آسان مگر ہر لفظ کلیجے میں گڑنے والا ہے۔ اصلی معنی کچھ ہی ہوں مگر ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ایک بد نصیب بُلبل صیاد کے پھندے میں آ پھنسی۔ بہار کا موسم تھا۔ باغ پھُولوں سے مہک رہا تھا۔ ہزاروں ارمان دل میں تھے۔ مگر صیاد کے ظلم نے ساری امنگوں کا خاتمہ کر دیا۔ باغ چھُوٹا۔ پھُول چھُوٹے۔ آشیاں چھُوٹا اور ان سب کے بدلے میں قفس کی تیلیاں اور صیاد کا آب و دانہ میسر ہُوا۔ بہتیرا سر ٹکرایا۔ ہر چند پھڑ پھڑائی۔ مگر نہ رہائی ہُوئی نہ جان نکلی۔ اسی حالت یاس میں دِن پُورے کر رہی تھی کہ صیاد نے ایک اور بُلبل کو پکڑا اور اسی پنجرے میں قید کیا۔ وُہ دِل جو مر چکا تھا۔ جس کے تمام ارمان۔ جس کی ساری آرزوئیں بے رحم صیاد نے ختم کر دی تھیں ایک ہم وطن کی صُورت دیکھ کر پھر تازہ ہُوا۔ نئی بُلبل

ہے ہر ایک کی خیر صلاح پوچھی۔ سرو کا درخت کس طرح ہے؟ گلاب کا پودا اچھا ہے؟ میرے آشیاں کی کیا خبر ہے؟

بلبلِ نو گرفتار باغ کا مفصل حال بیان کرتے کرتے اتنا کہ کر رُک گئی کہ کل میری گرفتاری سے کچھ دیر پہلے تیرے آشیاں پر بجلی گری اور جلا کر خاک کر دیا۔ حسرت بھرا دل یہ سُن کر کہتا ہے کہ پیاری بہن ڈر نہیں۔ صاف صاف کہ کہ اب وہ آشیاں میرا نہیں ہے۔ مَیں کہاں۔ نہ اس قید سے چھوٹوں گی نہ آشیاں کی صورت دیکھوں گی ؀

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

کم و بیش ایسی ہی حالت آج کل ہمارے ہاں بیویوں کی ہے۔ ایک خطبۂ نکاح نے اِن سے تیرہ چودہ برس کے عزیز دم بھر میں چھٹوا دیئے اور ایک شخص کے قبضے میں پہنچا دیا جس کے اوپر زندگی کا تمام دار و مدار ہے ؀

ماں باپ غیروں کی طرح الگ ہو گئے۔ سہیلیاں بہنیلیاں۔ بہنیں۔ بھاوجیں سب چھوٹیں اور تقدیر نے ایک ایسے گھر میں لا ڈالا۔ جس کی پہلے صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ یہ سب کچھ کیوں؟ اس اُمید پر کہ سمجھدار

شوہر قدر کریں گے۔ دیکھیں گے اور سمجھیں گے کہ یہ کون ہیں۔ کہاں سے آئیں۔ کیوں آئیں؟ اِن کو روٹی نصیب نہ تھی۔ کپڑے کو محتاج تھیں۔ رہنے کو جگہ نہ تھی ماں باپوں کو دُوبھر تھیں۔ آخر کوئی تو وجہ تھی کہ جنہوں نے دُکھ سُکھ سہہ مصیبتیں جھیل کر پالا پوسا۔ وہ بالکل ہی لا دوست ہو گئے۔ یا دم بھر آنکھ سے اوجھل کرنے کے روادار نہ تھے یا مہینوں ہو جائیں اور آکر خبر نہ لیں۔ ایک ایسے شخص کے اوپر سے جو اب تک قطعی غیر تھا۔ اپنے تمام حقوق قربان کر دئے اور جان بیچ کر سَودا کیا۔ اگر ایسا سَودا کرنے والے ٹوٹا بھگتیں تو اُن کے بد نصیب ہونے میں کیسے کلام؟

افسوس آتا ہے۔ ان شوہروں کی حالت دیکھ کر جو بیوی کے معنی ہی خدمت گذار کے سمجھتے ہیں۔ مانا کہ بعض جگہ بیویوں کی قدر وہ ہو رہی ہے جو ہونی چاہیئے۔ مگر اُن سے بہت زیادہ مٹی پلید ہو رہی ہے۔ جو نہ ہونی چاہیئے۔ میاں۔ ساس۔ نند۔ نند کے بچے۔ دیور جیٹھ اُن کی اولاد۔ غرض اِن سب کو رضامند رکھنا اس کا فرض۔ کوسنے۔ فضیحتیاں۔ طعن تشنیع اس کا انعام۔ طلاق کا ڈراوا دوسرے نکاح کی دھمکی ان خدمتوں کا صلہ۔ جن بیچاریوں نے کبھی خواب میں بھی محنت نہ کی تھی دن بھر پاپڑ بیلیں۔ ایک ایک کا آگا تاگا۔ ایک ایک کی للّو پتّو۔ غرض

زندگی کیا ہوئی وبال بن گئی ۔ پکاؤ ۔ ریندھو ۔ سیئو ۔ پروؤ ۔ جھاڑو بہارو ۔ لیپو ۔ پوتو ۔ غرض گھل گھل کر خاک اور جل جل کر کوئلہ ہو جاؤ ۔ مگر پھر کسی کے بھاویں نہیں ۔ آنے جانے والے پھوہڑ بتائیں ۔ ملنے جلنے والے کیڑے ڈالیں ۔ زبان دراز وہ ۔ کام چور وہ ۔ جل جوگنی وہ ۔ بے ڈھنگی وہ ۔ غرض کوئی عیب ایسا نہیں جو اعمال نامہ میں موجود نہ ہو ۔ ناقص العقل اس کا خطاب ۔ بیوقوف اس کا لقب ۔ مختصر یہ کہ کتّے کی زندگی اس سے بہتر ہے ۔ جس کو موت کی کبھی تمنا نہیں ہوتی ۔ یہ بحث کہ جو بیویاں اپنے فرض ادا نہیں کرتیں کس سلوک کی مستحق ہیں یا بیویوں پر شوہروں کے کیا حقوق ہیں ۔ آئندہ سہی ۔ اس وقت تو افسوس اس کا ہے کہ آج نوبت یہاں تک پہنچی کہ بہت سے اللہ کے بندے بیویوں کے مقابلے میں انسانیت ہی کھو بیٹھے ۔ ہمارے خیال میں کسی شخص کی آئندہ زندگی برباد کرنے سے زیادہ نہ کوئی بڑا گناہ ہے نہ ظلم ۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ آئے دن یہ گل کھل رہے ہیں اور پھر مزہ یہ کہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں ۔ خوب کیا کہیں مذہب کی آڑ کہیں ۔ ضرورت کا بہانہ ۔ اگر اسلام کے یہ معنی اور انسانیت کی یہ صفت ہے تو اِس اسلام اور انسانیت دونوں کو سلام ۔ کسی بزرگ کا مقولہ ہے ۔ کہ " الٰہی بچائیو اسلام کو اُن لوگوں سے جو اس کی ہنسی اڑائیں "

سب سے بڑی نعمت زندگی مجھ پر نثار کر دی۔ جس کو دُنیا میں خوش رہنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا مجھے۔ میری وجہ سے تڑپ تڑپ کر دن اور بیٹھ بیٹھ کر راتیں بسر کر رہی ہے۔ اس کو کیوں خیال آئے کہ یہ دہکتی ہوئی انگیٹھیاں۔ یہ نرم نرم تکیے اور گرم گرم بچھونے مجھ پر حرام ہیں۔ اس لئے کہ وہ رنج و غم کی شریک عمر بھر کی ساتھی دُکھ درد کی رفیق۔ جس سے نباہ کا وعدہ اور وفاداری کا اقرار تھا آج جاڑوں کی پہاڑ کی سی راتیں ٹھنڈے کپڑوں میں تارے گن گن کر کاٹ رہی ہے *

زندہ ہیں ایسی بہت سی اللہ کی بندیاں جو آنکھوں میں رہیں۔ چاؤ چونچلوں سے پلیں۔ مگر وہ ساری اللہ آمین میکے ہی تک تھی۔ ظالم شوہروں کے پتھر دل اور سخت ہاتھوں نے کوار پتے کے ساتھ ہی دُنیا کی بہار ختم کر دی۔ جو نگاہ محبت بھری معلوم ہوتی تھی زہر میں بجھی نکلی۔ جس دم سے قبر تک ساتھ دینے کی اُمیدیں تھیں۔ طوطے کی طرح دیدے بدل گیا *

یہ شوہر والی رانڈیں۔ وارث رکھتی بے وارثیاں اور بیواؤں سے بدتر سُہاگنیں اپنے دن پُورے کر رہی ہیں۔ اِن کے پھوٹا دل جنھوں نے اندر ہی اندر ریں کر ان کو قبریں جھکا دیں۔ ایک ایک صورت کو حسرت سے تک رہے ہیں۔ دُنیا ان کے لئے دوزخ ہے۔ اور کوئی اتنا

نہیں کہ ان دکھیاریوں کی مدد کرے۔ مگر یہ مصیبت سدا رہنے والی نہیں۔ ایک زبردست مددگار کی توقع موجود ہے دن اس کے انتظار میں گذر رہے ہیں اور راتیں اِس کی راہ میں بیت رہی ہیں۔ قریب ہے کہ وہ سچّا رفیق۔ موت۔ ان کی مصیبتوں کو ختم کر دے۔ جس طرح میکے سے وداع ہو کر یہ سُسرال آئیں۔ اسی طرح سُسرال سے رُخصت ہو کر قبر میں پہنچیں گی۔ دُنیا ان سے چھوٹ جائے گی۔ مگر یہ ایسی یادگار چھوڑ جائیں گی کہ دُنیا کے سننے والے ان کے نام کو آنکھوں پر رکھیں گے ۔

(۲)

جو دُنیا رنگ برنگ کے جلوے دِکھا اور مزے مزے کی باتیں سُنا رہی تھی بے وفا نِکلی۔ جس عُمر پر بڑا بھروسا اور پوری تقویت تھی۔ پل مارتے میں ختم ہوئی۔ اور یوم الحساب سر پر آ پہنچا۔ دُنیوی حکومتیں چار دن کا دَور دَورہ تھا۔ آج اُس حقیقی بادشاہ کا راج ہے۔ جس کی سلطنت کو کبھی زوال نہیں اور جس کے فیصلے کا اپیل ہے نہ مرافعہ۔ بڑی بڑی سلطنتوں کے تاجدار سرنگوں کھڑے ہیں اور ہوا کانوں میں یہ صدا پہنچا رہی ہے :-

"یہ ہے وہ دن جس میں بدلہ دینے کا وعدہ تھا"

ایک وسیع میدان مردوں اور عورتوں سے پٹا پڑا ہے۔ فریادیوں کے غول سے دفعتاً عورتوں کا ایک گروہ علیحدہ

ہوا اور ایک عورت نے یہ فریاد شروع کی :

"بادشاہوں کے بادشاہ - بے وارثوں کے وارث - بد نصیبوں کی فریاد سن اور دکھیاریوں کا فیصلہ کر - ہم ہیں وہ کمبخت جن پر دنیا کا عیش حرام اور جینا وبال ہو گیا - اے سچے معبود ! عمر کی کوئی گھڑی اور زندگی کا کوئی لمحہ سکھ سے نہ گذرا - الہ العالمین ! شوہروں نے ہمیں دھوکا دیا اور ہماری زندگی دوزخ کر دی - ان پیاروں سے توڑا جو ہم پر پروانہ تھے - ایسے پنجرے میں بند کیا کہ عمریں سر ٹکراتے بسر ہوئیں - دنیا کی کسی نعمت کا لطف اٹھانا ہمیں نصیب نہ ہوا - ہم نے ان شوہروں کی اطاعت میں کمی نہ کی - نوکروں سے زیادہ خدمت اور عزیزوں سے زیادہ بڑھ کر محبت کی - مر گئے اور ان کی آن بان میں فرق نہ آنے دیا - کٹ جائے یہ زبان اگر ان کی یہ شکایت کی ہو - اڑ جائیں یہ ہونٹ اگر ان کو بد دعا دی ہو - راتیں اس آرزو میں صبح اور دن اس امید پر شام کئے کہ ان کو ہماری حالت پر رحم آئے - مگر اے آسمان و زمین کے بادشاہ ان کے مشغلوں نے انہیں اتنی فرصت نہ دی کہ یہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتے - ماں باپ جیسی نعمت عمر جیسی دولت - بےفکری جیسی راحت ان کی نذر کی - گھر چھوڑا بار چھوڑا - برسوں کا رشتہ توڑا - پیاروں سے منہ موڑا - مگر اس کا پھل یہ ملا کہ سلگ سلگ کر دن کاٹے

اور گھلس گھلس کر وقت گذارا۔ یہ ہم کو عمر بھر رفیق رہنے
کے وعدوں اور قبر تک ساتھ دینے کے اقراروں پر لائے
مگر اے کمزور اور طاقتور دونوں کے مالک! رات کی سیاہی
میں کالا بھنورا آسمان ہمارے سر پر ہوتا۔ بجلی چمکتی۔ بادل گرجتا
چور آتے۔ دیواریں گرتیں۔ دکھ ہوتے۔ بیماری ہوتی۔ اور یہ
سنگدل جو آج تیرے حضور میں حاضر ہیں۔ دیوار بیچ مزے
اُڑاتے اور ہم سے اتنا بھی نہ پوچھتے کہ کیوں کر گذری اور
کیا گذری۔ اے عدل حقیقی کا وعدہ کرنے والے حاکم! عمر
اس اُمید پر ختم کی ہے کہ آج تیرے دربار سے داد ملے
گی۔ ہم مظلوموں کی حمایت لے اور وہ لوگ جو ہماری
مصیبتوں پر ہنسے آج انہیں دکھا دے کہ جن کا کوئی نہیں
ان کا تو وہ جس کی تسبیح سمندر میں مچھلیاں۔ ہوا میں پرند
جنگل میں درند۔ زمین پر آدمی آسمان پر فرشتے کہتے رہے
تو وہ جس کو ہم نے دُنیا میں پوجا۔ آج دین میں ہمارے
صبر کا اجر دے۔ ازلی اور ابدی راج تیرا۔ آج وہ دن ہے
کہ راجا پرجا۔ امیر فقیر۔ ظالم مظلوم۔ بے گناہ معصوم۔
منہ زور۔ کمزور۔ سب تیرے فیصلے کا مُنہ تک رہے ہیں۔ دلوں
کا حال جاننے والے بادشاہ! رہ رہ کر ہوک اٹھتی ہے۔
کن بے دردوں سے پالا پڑا تھا۔ کہ خوشی کی صورت تک ہم
کو نہ دیکھی۔ اے بے کسوں کے والی! تو گواہ ہے۔ کہ
فاقوں سے دن گذرے۔ پیوندوں کی نوبت آئی۔ ایک ایک

پیسہ ایک ایک اشرفی ہو گیا۔ بیماری کی راتیں پہاڑ ہو کر کٹیں۔ مگر ان تیرے بندوں کا دل نہ پسیجا *

سچے معبود! ہمارے دُکھے ہوئے دِل تیرے حضور میں فریادی آئے ہیں۔ دِکھا دِکھا۔ اے سچے معبود! دکھا دے کہ مظلوموں کا وارث اور بے کسوں کا والی تو ہے *

(قطرات اشک)

۱۱۔ دادا بھائی نوروجی

(پنڈت برج نراین چکبست لکھنوی)

پنڈت برج نراین چکبست بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے۔ ۱۸۸۲ء میں بہ مقام فیض آباد پیدا ہوئے۔ مگر چند ہی سال بعد لکھنؤ چلے آئے اور وہیں تعلیم پائی۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کرکے وکالت شروع کر دی۔ اس پیشہ میں آپ کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ اور آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں تھا۔ ۱۲۔ فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی میں آپ رائے بریلی تشریف لے گئے۔ عدالت میں بحث کی اور سہ پہر کو لکھنؤ لوٹنے کے لئے اسٹیشن پر آئے ریل میں بیٹھے تھے کہ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہو گئی۔ ہمراہیوں نے یہ حالت دیکھ کر ریل سے اتار کر ویٹنگ روم میں لٹا دیا۔ ڈاکٹر آئے، علاج ہوا۔ مگر سب بے سود۔ سات بجے شام کو اسٹیشن ہی پر انتقال کیا۔ اور آپ کے بڑے بھائی رائے

صاحب پنڈت مہاراج نرائن چکبست ایگزیکٹو آفیسر لکھنؤ میونسپلٹی گیارہ بجے رات کو آپ کی لاش موٹر میں رکھ کر لکھنؤ لائے۔ جناب کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی نے آپ ہی کے مصرع سے تاریخ نکالی ۔

ان ہی کے مصرع سے تاریخ ہے ہمراہ عزا
موت کیا ہے ان ہی اجزا کا پریشاں ہونا ۱۳۴۴ھ

(از مضامین چکبست)

چکبست شاعر بھی تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام "صبح وطن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اور آپ کے نثری مضامین "مضامین چکبست" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ ان ہی مضامین میں سے ایک مضمون یہاں درج کیا گیا ہے ۔

چکبست کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ جس پر آپ کو پوری قدرت حاصل ہے۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ صاف الفاظ میں کہتے ہیں۔ سادگی اور روانی کے اعتبار سے آپ کی نثر بہت دلکش ہوتی ہے۔ طرز تحریر کی متانت اور سنجیدگی نے آپ کو اعلیٰ پایہ کا انشا پرداز اور تنقید نگار ثابت کر دیا ہے۔ افسوس عمر نے زیادہ وفا نہ کی ورنہ کیا کیا تنقیدی مضامین آپ کے قلم کے سایہ میں ہم تک پہنچتے ۔

چکبست کا اسلوب بیان یوں تو ہر مقصد کے لیے موزوں ہے۔ لیکن خاص طور پر تنقید نگاری کے لئے زیادہ مناسب ہے ۔

یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ

جب انیسویں صدی کے آغاز میں زمانے کے انقلاب میں ہندستان کی قدیم سلطنت کے ساتھ قدیم تہذیب کا بھی ورق اُلٹا تو نئے دور کے انداز معاشرت کی داغ بیل ڈالنے کے لئے چند ایسے پاک طینت بزرگ پیدا ہوئے۔ جن کے دل محبت سے پُر تھے اور جن کی آنکھیں اس دُور اندیشی کے نُور سے روشن تھیں۔ جن کی بدولت انسان پُرانی روش کے نقش قدم کو نقش عبرت سمجھ کر آیندہ شاہراہ تلاش کر لیتا ہے۔ اس زمرے میں کچھ پاک روحیں ایسی تھیں جو مذہبی اور سوشل اصلاح کے عالم میں گرم سیر رہے۔ انہوں نے قدیم تعصبات اور توہمات کے بُت توڑے اور خود غرضی و جہل کے تنگ و تاریک معبد کو وسعت دے کر اپنے بلند نظری کے فیض سے نورانی بنایا راجہ رام موہن رائے۔ سوامی دیانند سرسوتی۔ مسٹر رینڈے وغیرہ کا شمار ایسے ہادیان طریقت میں ہے۔ ان بزرگوں کے علاوہ چند ایسے پیمبران اصلاح ظہور میں آئے جنہوں نے پولیٹکل بیداری کا صور پھونکا اور اپنے مُردہ دل ہم وطنوں کو پستی و گمنامی کے گورستان سے نجات دے کر قومی زندگی کی جنّت کا راستہ دکھا دیا۔ اس رنگ پر چلنے والے لوگوں میں دادا بھائی نورو جی۔ سریندر ناتھ

بنرجی - سرسید احمد خاں وغیرہ ہیں - اس میں شک نہیں
کہ ان نیک حضرات کی کوششوں کا برقی اثر اکثر مذہبی
اور سوشل اصلاح کے دائرے تک بھی پہنچا - لیکن بحیثیت
مجموعی ان کے زندگی کے کارناموں کا اندازہ کیا جائے
تو یہی ثابت ہوگا کہ ان کا سرمایۂ حیات زیادہ تر اپنے
ہموطنوں کے پولیٹکل حقوق کی وسعت کے لئے وقف رہا
ان گرانقدر بزرگوں میں ہمارے مضمون کا تعلق دادا بھائی
نورو جی سے ہے اور ان دو چار صفحوں میں عزیزان وطن
کے سامنے اس فدائے ملک کے پولیٹکل عقائد کا خاکہ پیش
کرنے کی کوشش کی جائے گی ؎

دادا بھائی نورو جی کے سوانحی حالات زیادہ تفصیل
طلب نہیں - کیونکہ ہر سال جو مضامین آپ کے متعلق شائع
ہوتے رہتے ہیں - ان کی وجہ سے یہ حالات زبان زد عام
ہو رہے ہیں - ہاں غور کا مقام ہے تو یہ ہے کہ وہ بچہ
جس کے سر سے چار برس کی عمر میں باپ کا سایہ اُٹھ
گیا ہو - جس نے شیر مادر کے ساتھ مفلسی کا مزہ چکھا
ہو - سوائے غریب ماں کے کوئی خبر گیران نہ ہو - ایسا
قابل اور ہونہار نکلے - کہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک
ہر رنگ اور ہر عالم میں اپنے ہم جلیسوں میں ممتاز رہے
اور مُدت العمر تک ملکی کشتی کا ناخدا سمجھا جائے - فیضان
قدرت اسی کو کہتے ہیں اور انسانی زندگی کی عظمت اسی

کا نام ہے۔ الفنسٹن کالج میں طالب علمی کے زمانے میں
دادا بھائی کے معلموں کا یہ قول رہا کہ یہ لڑکا کروڑ میں
ایک ہوگا۔ اسی کالج میں جو علمی انجمن قائم ہوئی۔ اس کے
روح رواں یہی تھے۔ تعلیم نسواں کا پہلا مدرسہ بمبئی میں
دادا بھائی نے قائم کیا۔ نیز علمی ترقی اور سوشل تربیت کے
لیے جو انجمنیں قائم ہوئی ہیں اور جو زمانے کے ہاتھوں
سے اب تک محفوظ ہیں۔ ان کے نشو و نما کا سہرا دادا بھائی
کے سر ہے۔ بمبئی میں پہلی مرتبہ جو دیسی اخبار آزاد خیالی اور
روشن دماغی کی اُمیدوں پہ قائم کیا گیا۔ اس کے ایڈیٹر
دادا بھائی ہی تھے۔ ہندوستان میں پہلی مرتبہ دادا بھائی
الفنسٹن کالج میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اور
اس مشہور کالج کے لیے آپ کی خدمات باعث ناز
ہیں۔ بڑودہ کے دیوان کی حیثیت سے جو شان مدبری کے
کرشمے دادا بھائی نے دکھائے۔ اُن سے اس ریاست
کی تاریخ کے صفحے روشن ہیں۔ دادا بھائی اس کارخانے
کے سربرآوردہ شرکاء میں تھے جس نے کہ پہلی مرتبہ انگلستان
سے براہ راست تجارت شروع کی۔ بمبئی کی مجلس وضعان
قانون کے نامور اراکین میں دادا بھائی کا شمار رہا ہے۔
انگلستان اور ہندوستان میں جو شاہی کمیشن مقرر ہوئے۔
دادا بھائی کو ان کے ممبر ہونے کا امتیاز حاصل رہا۔ یہی
پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے پارلیمنٹ کے شاہی دربار

میں کرسی پاکر اپنے وطن کا نام روشن کیا۔ دادا بھائی پہلے حبیب وطن ہیں جن کے سر پر قوم نے تین مرتبہ کانگریس کی صدر نشینی کا تاج رکھا۔ ان تمام واقعات کا تفصیل وار لکھنا ایک طولانی سوانح عمری لکھنا ہے۔ ذیل کے مضمون میں محض اس پولٹیکل مذہب کے چند حقیقی پہلوؤں پر تنقید کی نظر ڈالی جائے گی۔ جس کے دادا بھائی پیمبر ہیں*

ہندوستان میں تقریباً ڈیڑھ سو برس سے سلطنت برطانیہ کا پھریرا لہرا رہا ہے۔ یہ زمانہ تین حصّوں میں تقسیم ہوتا ہے پہلے دَور سے وہ سراسیمگی کا عالم مراد ہے جبکہ میدان جنگ میں انگریزی سنگینوں کے زور سے دولت برطانیہ کی حکومت کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ دوسرے دَور میں یہ بنیاد مستحکم ہوئی اور قضاو قدر کے محکمے سے یہ فرمان جاری ہوا کہ آخرکار نیک نامی یا بدنامی کی تدبیروں سے ہندوستان کا نگین تاج برطانیہ میں جڑ دیا گیا۔ تیسرا دور وہ دُور اندیشی اور زمانہ شناسی کا عہد تھا۔ جب کہ واقعات کی رفتار دیکھ کر یہ مسئلہ پیش آیا کہ نئی حکومت اور نئے انداز معاشرت کے مطابق ہندوستان کی دنیا کو اپنی زندگی کا کیا دستور العمل قرار دینا چاہئے۔ جس کام کے لئے پہلے دودور وقف رہے وہ کام اہل ہند کی مدد کا محتاج نہ تھا مگر تیسرے دور کے کار عظیم انجام دینے کے لئے بہت

کچھ اہل ہند ذمہ دار تھے۔ اس کارِ عظیم کے معنی یہ تھے کہ ہندوستانی نظام معاشرت میں اور ملک کی انقلابی حالت میں تناسب کا رشتہ قائم کیا جائے تاکہ انسانی کشاکش حیات کے عالم میں ہندوستانیوں کی ہستی قائم رہے۔ اس مسئلے کے حل کرنے کے لئے اس وقت کے عالی دماغ بزرگوں نے یہ روش اختیار کی۔ ایک جانب تو حکمران قوم اور دل شکستہ رعایا کے تعلقات میں رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور دوسرے جانب ہندوستان کے مختلف فرقوں کی بکھری ہوئی کڑیوں کو ایک سلسلے میں لاکر کل قوم کی شیرازہ بندی کی فکر کی جائے۔ ان بزرگوں میں دادا بھائی کا نام سب سے زیادہ قابل امتیاز ہے۔ جن حضرات کی نظر سے دادا بھائی کی پولیٹکل تقریریں اور تحریریں گذری ہیں وہ جانتے ہیں کہ شروع سے اُن کا مسلک یہی رہا کہ ہندوستان کی بہبودی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اہل ہند سلطنت برطانیہ کی وفاداری سے منہ نہ موڑیں۔ اور باضابطہ تحریک و بحث کی مدد سے بلا لحاظ ملّت و مذہب یک دل و یک زباں ہو کر اپنے پولیٹکل فرائض انجام دیں اور اپنے پولیٹکل حقوق کی توسیع کی کوشش کریں۔ دادا بھائی کا عقیدہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ جو امن و امان کی نعمت ہندوستان کو دولت برطانیہ کے سایے میں حاصل ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرنا اہل ہند کا فرض ہے اور نیز جو برکتیں اس مہذب حکومت

کے ساتھ وابستہ ہیں اُن سے کوئی چشم پوشی نہیں کر سکتا مگر باوجود ان محاسن کے انگریزی حکومت کے دامن پر دو داغ ایسے ہیں جو کسی طرح مٹائے مٹ نہیں سکتے۔ اولاً حاکم و محکوم کے مالی تعلقات ایسے غیر منصفانہ ہیں۔ کہ ہندوستان کے تیرہ خاکدان میں روز بروز مفلسی کا اندھیرا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ثانیاً ہندوستان کے باشندوں کے لیئے اعلیٰ ذمہ داری اور اعزاز کے عہدوں کا در بند ہو گیا۔ لہذا ان کی دماغی اور اخلاقی ترقی کا معیار ادنیٰ ہوتا جاتا ہے کیونکہ جن قابلیتوں کو اظہار کا موقعہ نہیں ملتا۔ ان کی نشو و نما ممکن نہیں۔ ان عیوب کے فنا کرنے کے لیئے دادا بھائی نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے اور ہمیشہ اُن کی تلقین یہی رہی ہے کہ جو متنفس ہندوستان کی خاک سے اٹھا ہے اس کا یہ فرض ہے کہ وہ باضابطہ بحث و تحریک کی مدد سے اپنے درد دل کی داستان حکمران قوم کے کان تک پہنچائے آج جب کہ ہندوستان میں پولیٹکل معرکہ آرائیوں کا بازار گرم ہے۔ یہ تلقین روز مرہ کی گفتگو میں شامل ہے مگر جس وقت دادا بھائی نے باضابطہ بحث و تحریک و قومی اتحاد و یگانگت کا وعظ شروع کیا۔ وہ زمانہ ہندوستان کے لیئے عجب بے خبری کا زمانہ تھا۔ چاروں طرف جہل و خود پرستی کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ۱۸۲۵ء میں مرہٹوں کی قوت شکست کھا چکی تھی۔ مگر ان کے خون آشام تلواریں

ابھی پوری طور پر میان میں نہیں داخل ہوئی تھیں۔ رسّی جل گئی تھی مگر بل قائم تھا۔ دہلی کی گذشتہ عظمت کے مزار پر ایک دھیمی سی شمع ابھی تک جل رہی تھی۔ اودھ میں نوابی دور کا نشہ قائم تھا۔ سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان میں نفاق کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ انگریزی تہذیب و تربیت کے نشو و نما کا زمانہ دور تھا۔ قومی اتحاد اور پولیٹکل نجات کے ولولے دلوں نے محسوس نہیں کئے تھے۔ کانگریس کا خیال خواب میں بھی نہیں پیدا ہؤا تھا۔ ایسے عالم میں اہل ہند کے پولیٹکل حقوق کی حفاظت کا خیال پیدا ہونا اور پھر اس خیال کا کسی خاص فرقے یا قوم تک محدود نہ رہنا ایک عجیب روحانی وقار اور بلند نظر کا کرشمہ تھا۔ میرے دوستو! عظیم الشان پیشوایان قوم جس نگاہ سے زمانہ کی رفتار دیکھتے ہیں۔ اس نگاہ سے معمولی نظر کا آدمی نہیں دیکھ سکتا۔ جہل و تعصب کے پردے اُن کی آنکھوں سے اُٹھ جاتے ہیں۔ کوتاہ اندیشی اور مذہبی تعصبی کی آہنی دیواریں ان کے سامنے شق ہو جاتی ہیں اور وہ عالم خیال میں اپنی روحانی پاکیزگی کی روشنی کی مدد سے آیندہ منزل مقصود کا جلوہ اپنی عقیدت مند آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور اسی طرف اپنے ان دوستوں کو چلنے کی تلقین کرتے ہیں جن کی نظر اتنی بلند نہیں ہے اور جن کے خیال کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے۔ دادا بھائی

کی بلند نظری اور اخلاقی عظمت کا وقار ہمارے دل میں اور بڑھ جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اب بیسویں صدی کے آغاز میں جبکہ انگریزی تہذیب کا سکہ ہمارے دِلوں پر چل رہا ہے۔ جبکہ مغربی قومیں اتحاد اور جمہوری اصولوں کی ترقی کی بدولت روئے زمین کا نقشہ بدلتی جاتی ہیں۔ ہماری مبارک سرزمین پر ایسی خُدا کی مخلوق انسان کی شکل میں موجود ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کا پولیٹکل اتحاد اک امر محال ہے اور جس کے مذہب میں منصفی اور سب ججی کی چار دن کی چاندنی حاصل کرنے کے لیۓ ایک دُوسرے کا گلا کاٹنا ثواب میں داخل ہے مگر دادا بھائیؔ کی طینت میں اس کفر کو کبھی دخل نہ تھا۔ اُن کی دُور اندیش نگاہوں کو پچاس برس قبل وہ راستہ نظر آگیا تھا۔ جس پر اس وقت ملک کے بہترین دماغ چلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سریندر ناتھ بنرجی اسی بیشہ کے شیر ہیں۔ بدرالدین طیب جی اِسی مذہب کا کلمہ پڑھتے تھے۔ رومیش چندر دت اسی شمع کے پروانے ہیں۔ پروفیسر گرکھلے اسی چمن کے بُلبل ہیں۔ اور کالی چرن بنرجی اسی کلیسا میں سجدہ کرتے ہیں ۔

مگر اٹھارہ یا اُنیس سال کا عرصہ ہُوا کہ اس عام عقیدے کے خلاف ایک زبردست اور پُر شوکت آواز علی گڑھ سے بلند ہُوئی اور یہ آواز اب تک مسلمانوں کے ایک

کثیر حصے میں گونج رہی ہے۔ یہ سر سید احمد خان (نور اللہ مرقدہ) کی آواز تھی۔ سر سید احمد مرحوم کے سر میں بھی دادا بھائی کی طرح حُبِ قوم کا سودا سمایا ہوا تھا۔ اور اس فدائے قوم کی کوششوں میں اسی سرگرمی اور مستقل مزاجی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ جو تمام عظیم الشان انسانوں کا جوہر ہے اور جو اصلاحیں سر سید کی زبردست تدبیر دل سے مسلمانوں کے تعلیمی۔ سوشل اور مذہبی نظام میں ظہور میں آئیں اُن کے ذکرِ خیر سے آیندہ نسلوں کی زبان ہمیشہ تر رہے گی۔ مگر سر سید کا پولیٹکل مذہب دادا بھائی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ سر سید نے اہل اسلام کو یہ سبق دیا کہ اُن کو حُکام وقت کی شفقت اور انصاف پسندی پر بھروسا رکھنا چاہیئے اور پولیٹکل بحث و تحریک سے اپنا دامن آلودہ نہ کرنا چاہیئے۔ سر سید کی صدق نیّت میں شک کرنا کُفر ہے۔ جو کچھ اس حبیب قوم نے کیا اپنے ہم مذہبوں کی سچّی بہبودی کے خیال سے مگر با اینہمہ ہماری ادب آموز نگاہیں یکایک اس عظیم الشان بزرگ کی خیالی تصویر کی طرف اُٹھتی ہیں اور ہماری زبان سے بے ساختہ یہ کلمہ نکلتا ہے کہ افسوس سر سید نے باوجود اعلیٰ درجہ کی مدبّری اور عالی خیالی کے اپنے زمانے کی پولیٹکل تہذیب کی قوتوں کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ میرے دوستو! سر سید کا پولیٹکل عقیدہ دادا بھائی کے مذہب ہی کے خلاف نہیں

بلکہ دُور اندیشی اور زمانہ شناسی کے خلاف بھی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس وقت ہندوستان کی تمدّنی ترقی کی معرکہ آرائیوں میں مغربی قوموں سے مقابلہ کرنا ہے اور یہ مقابلہ کامیابی کے ساتھ اسی حالت میں ہو سکتا ہے جبکہ ہم ان آلات حرب سے واقف ہوں جو کہ مغربی قوموں کے قوتِ بازو بنے ہوئے ہیں۔ یہ آلات حرب کیا ہیں۔ اُن کی تہذیب معاشرت کے جمہوری اصول ہیں۔ اگر اہل ہند کچھ روز دُنیا میں عزّت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ان کو اپنی ترقی کے راستے میں انہی اصولوں کو سنگ نشان خیال کرنا چاہیئے انہی اصولوں کے مطابق ہم موجودہ تہذیب کا یہ رنگ دیکھتے ہیں کہ نظامِ معاشرت کے ہر صیغے میں ہر ایک قسم کے اقتدار و قوّت کا سرمایہ افراد واحد کے قبضہ سے نکل کر عوام میں تقسیم ہوتا جاتا ہے۔ وہ مذہبی پیشوا جو پیشتر اپنے قلم کی ایک گردش سے تخت و تاج کا فیصلہ کر دیتے تھے اب اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ مقلّدین کے خلاف کوئی فتوےٰ نہیں جاری کر سکتے۔ بڑے بڑے مسائل میں بیٹا باپ کے خلاف اپنے عقیدے کا اظہار کر سکتا ہے اور اس کا ایسا کرنا بے ادبی اور بد تہذیبی میں شامل نہیں سمجھا جاتا۔ اس جمہوری اصول کی نشو و نما زیادہ تر پولیٹکل دُنیا میں ہوئی ہے۔ شاہِ وقت یا وزیرِ اعظم کے احکامات محض عام رعایا کے مجموعی خیالات کا عکس ہوتے ہیں۔ اور

رعایا کو اختیار حاصل ہے کہ وہ حکام وقت کے خلاف اپنی ناراضگی کا باضابطہ اظہار کرے۔ اسی اصول کا پرتو دادا بھائی کے پولیٹکل مذہب میں بھی نظر آتا ہے وہ انگریزی حکومت کا استحکام ہندوستان کی بہبودی کے لیے نہایت ضروری خیال کرتے ہیں اور ان کی سچّی وفاداری سے پائنیر ایسے کافر کو بھی انکار نہیں ہے۔ مگر اسی کے ساتھ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اہل ہند کو حکام وقت کے سامنے اپنے ضروریات کا اظہار باضابطہ بحث و تحریک کے پیرائے میں کرنا چاہیے اور اپنے پولیٹکل حقوق کے تحفظ و توسیع کی کوشش میں سرگرم رہنا چاہیے۔ برعکس اس کے سر سیّد مرحوم کا عمل شیخ سعدی کے مقولے پر تھا۔ کہ ؎

اگر شہ روز را گوید شب است ایں

بباید گفت اینک ماہ و پرویں!

اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اصول موجودہ تہذیب و تربیت کے بالکل خلاف ہے ہم کو اس بات کی شکایت نہیں کہ سر سیّد نے کانگریس کو اپنی شرکت سے کیوں محروم رکھا۔ ممکن ہے کہ سر سیّد کو کانگریس کے اراکین کی نیک نیتی میں شک ہو یا اسی قسم کے اور خیالات۔ کانگریس سے اختلاف کے حامی ہوئے ہوں۔ ہم کو افسوس ہے تو یہ کہ سر سیّد نے تلقین کس اصول پر کی کہ مسلمانوں کو پولیٹکل بحث و تحریک سے قطعاً پرہیز کرنا چاہیے اور حکام وقت کی محبت اور انصاف پسندی پر کافی اعتماد رکھنا چاہیے۔ اگر کانگریس ان

کے امتحان میں پوری نہیں اتری تھی تو وہ مسلمانوں کے لئے دوسری پولیٹکل انجمن قائم کر سکتے تھے۔ مگر نہیں۔ اس جیب قوم کی تو مسلسل کوشش یہ رہی کہ مسلمان نوجوان پولیٹکل تعلیم کے سرچشمہ سے اپنے ہونٹ نہ تر کر سکیں۔ اس تلقین کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں باوجود اعلیٰ ذہانت کے ایسے بزرگ نظر نہیں آتے جو پولیٹکل یا تمدنی مسائل کے محقق سمجھے جائیں۔ ان میں دادا بھائی کے ایسے پولیٹکل رشی اور گوکھلے کے ایسے پولیٹکل سنیاسی معدوم ہیں۔ ایسے بزرگوں کا نہ پیدا ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ایسے لوگ قوم کی جان ہوتے ہیں۔ اور انہی کی اخلاقی عظمت سے قوم کی عظمت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ برعکس اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ نواب سلیم اللہ صاحب کے ایسے اکثر قوم فروش پیدا ہو گئے ہیں۔ جو پولیٹکل اور تمدنی تعلیم کی ابتدائی اصولوں سے بے بہرہ ہیں۔ اور جو ذاتی فروغ حاصل کرنے کے لئے کل قوم کی طرف سے یہ صدا لگانے کے لئے تیار ہیں کہ الٰہی آفتاب دولت درخشاں باد۔ لارڈ منٹو سلامت۔ نواب صاحب موصوف نے مسلمانوں کی ایک انجمن قائم کرنے کی فکر کی تھی جس کا دستور العمل یہ ہوتا کہ کانگریس کی ہر تجویز سے اختلاف کرے اور حکام وقت کی تائید کرے۔ اگر یہ قوم فروشی نہیں ہے تو کیا ہے اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ نواب محسن الملک اور شرف الدین صاحب کے ایسے

بزرگ نواب سلیم اللہ کے ایسے پولیٹیکل پیشواؤں کے پیچھے قومی ترقی کی نماز پڑھنے میں تکلف نہیں کرتے۔ ان باتوں سے اگر کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے تو وہ یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کے دل میں پولیٹیکل ترقی کے ابدی اصول ذہن نشین نہیں ہوئے ہیں اور وہ پولیٹیکل واقعات کی رفتار کا اندازہ کرتے ہوئے عارضی اور دائمی قوتوں میں فرق نہیں کر سکتے۔ میرے ہموطنو! نواب سلیم اللہ صاحب کی پولیٹیکل حکمت صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ کل ہندوستان کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ انگریزی حکام چاہے مصلحت کے خیال سے ایسے حضرات کی حرکات پر آفرین کہیں مگر وہ دل میں خوش نہیں ہو سکتے۔ وہ اس قوم کے رکن ہیں جس نے اپنے خون سے پولیٹیکل آزادی کے چمن کو سینچا ہے۔ اور جس کا یہ اصول ہے کہ جو شخص اپنے حقوق کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ ان حقوق کے حاصل کرنے کا مستحق نہیں ہے۔ اگر ان کی نگاہوں میں قدر ہو سکتی ہے تو دادا بھائی کے ایسے بزرگوں کی جن کی رگوں میں پولیٹیکل ترقی کا جوش بجلی کی طرح سرایت کر گیا ہے *

علاوہ ان اصولی کمزوریوں کے سر سید احمد مرحوم نے جو روشنی قائم کی ہے وہ اسی حالت میں عملی طور پر عارضی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے نفع رساں ثابت ہو سکتی ہے جبکہ ہندو ملکی حقوق کی توسیع و حفاظت کے لئے پولیٹیکل

معرکہ آرائیوں میں مصروف رہیں اور اپنے مسلمان ہموطنوں کو اس بات کا موقع دیں کہ وہ ان معرکہ آرائیوں سے اختلاف ظاہر کرکے حکام کی نگاہوں میں سرخروئی حاصل کریں۔ برعکس اس کے اگر ہندو بھی باضابطہ بحث و تحریک کے دائرے سے نکل کر اور ملکی ترقی کی کوشش کرکے مسلمانوں کی تحریکوں کی بیجا مخالفت شروع کر دیں تو اس وقت دونوں میں کوئی فرق قائم نہیں رہے گا اور حکام کو کوئی وجہ نہیں رہے گی کہ وہ مسلمانوں کی خوشنودی دلجوئی کی فکر کریں اور اُن کو اس چال سے پولیٹکل تحریکوں میں شریک ہونے سے باز رکھیں۔ کیونکہ اس حالت میں ہندو اور مسلمانوں کی حالت یکساں ہوگی۔ دونوں کا صرف مشغلہ یہ ہوگا کہ باہمی نفاق کی آگ مشتعل کرتے رہیں۔ اور پولیٹکل حقوق کی جانب رُخ نہ کریں۔ اس لحاظ سے بھی سرسید کی پولیٹکل تلقین پائیدار اصولوں پر مبنی نظر نہیں آتی۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ ہندوستان کی پولیٹکل ترقی کے لئے دادا بھائی کے اصولوں کی پیروی لازمی ہے اور آثار زمانہ بتلا رہے ہیں کہ ہمارے مسلمان ہم وطنوں میں ایک فرقہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو سرسید کی پولیٹکل نصیحتوں کو فراموش کرتا جاتا ہے۔ اور وہ زمانہ ضرور آنے والا ہے جب کہ سلطنت برطانیہ کے سایہ عاطفت میں تمام ہندو مسلمان دادا بھائی

کے پھریرے کے نیچے اپنے پرے جما کر پولیٹکل ترقی کی منزل میں قدم رکھیں گے +

ہندوؤں میں اکثر یاس پرور طبیعتیں مذہبی تعصب کے نشے میں دادا بھائی کے اُصولوں سے انحراف کرنے پر آمادہ ہیں۔ الغ۔ ناعاقبت اندیش حضرات کا خیال یہ ہے کہ ہندوؤں کو پولیٹکل اتحاد کی کوشش ترک کر کے مسلمانوں کی طرح محض اپنے ہم مذہبوں کی ترقی کی کوشش کرنا چاہیئے۔ مگر ہمارے دوستوں کو مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ قومی اتحاد و قومی ترقی کی منزلیں دشوار گذار ہیں۔ بگڑی ہوئی قسمت ایک دن میں نہیں بنتی ہے۔ مسلمان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان میں فطرتی طور سے ہندوؤں کی مخالفت کا مادہ موجود ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ مغربی اصول پورے طور سے ان کے ذہن نشین نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی زمانے کے مُعلّم نے اُنہیں قومی یگانگت کا سبق نہیں دیا ہے۔ لیکن وہ زمانہ بہت قریب نہیں ہے تو بہت دور بھی نہیں۔ جب کہ یہ زمانہ سازی کا رنگ زمانہ شناسی سے بدل جائے گا۔ دادا بھائی کی کوششیں کامل طور پر بار آور ہوں گی اور ہندوستان کی تاریخ میں قومی یگانگت کا نیا دور شروع ہوگا ہ

لذّت سیرِ دگر چشم تمنا لے گی + یک بار اور بھی دُنیا ابھی پلٹا لیگی

مایوسی کا کوئی مقام نہیں ہے۔ سچائی اور نیک نیتی کی قوتوں کو دنیا میں ہمیشہ فتح ہوئی ہے۔ عارضی ناکامیاں مردوں کا دل نہیں توڑ سکتیں۔ دادا بھائی کی عمدہ مثال آنکھوں کے سامنے ہے۔ مدت العمر کی معرکہ آرائیوں میں کیسی کیسی ناکامیابیوں سے انہیں سامنا ہوتا رہا ہے۔ اور زمانے کے ظالم ہاتھوں سے کون کون صدمے انہیں پہنچے ہیں۔ مگر ان کی ہمت میں کمی نہیں ہے اور ان کی نورانی پیشانی پر افسردگی کی شکن کا نشان نہیں نظر آتا۔ وہ اس وقت زندگی کے سفر کی بیاسی منزلیں طے کرنے کے بعد اپنے حج پیری کے نورانی عالم میں فرشتۂ امید کے ظہور کے منتظر ہیں۔ ان کو یقین ہے کہ زمانہ ضرور کروٹ بدلے گا۔ اور ہندوستان کی تقدیر چمکے گی۔ وطن کی محبت ان کے لئے مذہبی عقیدے کے درجے تک پہنچ گئی ہے۔ اور دلی جوش خون کے ساتھ رگوں میں دوڑ گیا ہے۔ اس خیال کی پختگی ان کی عظمت کا راز ہے۔ اکثر ایسے نیک نفس انسان ہیں جن کے دل رنج و درد کے نظارے دیکھ کر پگھل جاتے ہیں اور یہ امنگ پیدا ہوتی ہے کہ بیکس کی چارہ سازی کی جائے اور غریب کے زخم پر مرہم رکھا جائے۔ مگر جب دنیا کے فانوس خیال میں اور اور دلکش تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔ تو جو امنگیں درد و غم کے مرقعے دیکھ کر پیدا ہوئی تھیں وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ اور خود غرضی کے

جذبات ذاتی عیش و آرام کے دام میں اسیر کر دیتے ہیں یا اکثر عارضی ناکامیابی ہمت توڑ دیتی ہے اور مایوسی کی زنجیر پہنا کر گوشہ عافیت میں بٹھا دیتی ہے۔ مگر دادا بھائی کا سودا وہ سودا نہ تھا جو کہ دُنیا کے آدم فریب عیش و آرام کی ہوا سے دُور ہو جائے۔ یا جس پر یاس و بیم کے جذبات غالب آ جائیں۔ یہ وُہ سودا تھا جس کی بدولت اُنہوں نے اپنی تمام زندگی ملکی خدمت کے لئے نذر کر دی۔ اپنی راحت کو مُلک کی راحت پر قربان کر دیا۔ ملکی افلاس دُور کرنے کی کوشش میں اپنی مفلسی کو مفلسی نہ سمجھا اور جو پولٹیکل آرائی شباب ہیں شروع کی تھی۔ اُسے بڑھاپے تک اسی دم خم کے ساتھ قائم رکھا جن کے دلوں میں محبّت و ہمدردی کے سرچشمے خشک ہو گئے ہیں۔ اور قومی حمیّت و غیرت کے شعلے بجھ کر رہ گئے ہیں اور جو ذاتی نجات کو زندگی کا فرض ادنیٰ سمجھتے ہیں۔ اُن کی نظروں میں دادا بھائی کی مردانہ اور مسلسل کوششیں زیادہ وقعت نہیں پیدا کر سکتیں۔ مگر جو قومی محبّت کے بندے اور قومی خانقاہ کے در کے فقیر ہیں اور جن کے دل سنگ و خشت کے نہیں بنے ہُوئے ہیں۔ وہ اس قومی محبّت کے پُتلے کی عظمت کا اندازہ کر سکتے ہیں ؎

حریف ناوکِ مژگانِ خونریزم نیئ ناصح!
بدست آور رگِ جانے و نشتر را تماشا کن

۱۲- سقوط ادرنہ

(مولانا ابو الکلام آزاد دہلوی)

مولانا ابو الکلام آزاد کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں۔ ہندوستان کی سیاست میں آپ نے ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ لیکن یہاں ہمیں آپ کی انشا پردازی اور اسلوب بیان سے سروکار ہے۔ آپ کا شمار عہد حاضرہ کے بہترین انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ "الہلال" نے آپ کے مخصوص انداز بیان کو اور آپ کے مخصوص انداز بیان نے "الہلال" کو شہرت عام اور بقائے دوام بخشی۔ اخباروں میں "الہلال" نے جو شہرت اور مقبولیت حاصل کی تھی آج تک کسی اور اخبار کو حاصل نہیں ہوئی۔

مولانا آزاد کی زبان نہایت شیریں۔ صاف اور رواں ہوتی ہے۔ آپ کے طولانی جملوں میں توازن اور تسلسل لطف پیدا کر دیتا ہے۔ خیالات چونکہ سلجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے عبارت بھی سلجھی ہوئی اور مربوط ہوتی ہے۔ اور عام طور پر حشو و زوائد سے پاک۔

مولانا کو عربی الفاظ اور فارسی تراکیب کا خاص شوق ہے۔ لیکن نرا شوق ہی نہیں بلکہ آپ ان کو نہایت سلیقہ اور استادی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ آپ کی عبارت میں علمی اور فلسفیانہ عمق ہوتا ہے۔ بڑے بڑے مفہوم کو نہایت سہولت کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور پھر اس طرح کہ نہایت آسانی سے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ آپ کی تحریر میں عالمانہ وقار کے علاوہ خطیبانہ جوش بھی بدرجہ احسن موجود ہوتا ہے اور یہی آپ کے اسلوب بیان کی خصوصیت ہے۔

ایڈریانوپل جو خلفاء بلقان کی راہ کامیابی میں بظاہر آخر مانع کامیابی تھا۔ بالآخر مسخر ہو گیا۔ مع (جامع سلیم) کی مقدس محرابوں کے جنہوں نے دو صدیوں سے اپنے نیچے صرف سجدہ ہائے نیاز اور زمزمہ ہائے توحید و تکبیر ہی کو دیکھا تھا اور مع ان بلند اور عظیم البیت مناروں کے جن پر آج تک روزانہ اعلان و شہادت توحید کی ایک صدا بھی قضا نہ ہوئی تھی۔ وہ فتح ہو گیا۔ حالانکہ ہمارے جوش و بیداری کا لشکر عظیم اب تک غفلت و سرشاری کے قلعہ میں محصور ہے اور عبرت اور تنبیہہ کے پیہم ہجوم اب تک اسے مسخر نہیں کر سکے۔

میں سفر میں تھا۔ جب میں نے اوّل بار یہ خبر سُنی میں نے دیکھا کہ اس خبر کی تصدیق کے بعد بھی دُنیا

ویسی ہی تھی۔ جیسی اس سے پہلے۔ میں نے دیکھا کہ ہم اپنے کاروبار میں مصروف اور اپنی احتیاجات میں بدستور منہمک ہیں۔ وقت پر کھانا کھاتے ہیں اور وقت پر آرام دہ نیند کے انتظار میں بستروں کو تلاش کرتے ہیں زندگی کی مصروفیتوں میں کوئی تغیر نہیں ہوا اور اپنے اندر بھی دیکھا تو حالت ایسی ہی پائی۔ جیسی کہ کل تک تھی۔ حالانکہ ہم میں سے کوئی بھی اس خبر کے سننے کے لئے تیار نہ تھا۔

میں نے سوچا کہ کیا کسی دن اسی طرح قسطنطنیہ کے مسخر ہو جانے کی خبر آ جائے گی؟ قسطنطنیہ کیا شے ہے۔ میں نے سوچا کہ کیا ایک دن ہماری آخری متاعِ عزت یعنی بیت جلیل خلیل اللہ اور مسجد مطہرۂ رسول اللہ پر بھی ملاعنہ صلیب کے حملہ آور ہو جانے کی خبر آ جائے گی۔ اور ہم اسی طرح اپنی رفتار مدہوشی میں آگے بڑھ جائیں گے۔

دُنیا میں قوموں کے لئے بڑے بڑے کام ہیں۔ بہت سے ہیں جن کو اپنے ایوان حکومت اور تختِ جلال کی آرائش کرنی ہے۔ بہت سے ہیں۔ جن کو اپنے عظیم الشان متمدن شہروں اور اپنی عالمگیر تجارت کی حفاظت منظور ہے بعض اپنی قومی دولت و ثروت کے بڑھانے کی فکر میں ہیں۔ اور بعض خدا کی زمینوں پر قبضہ کرنے کے انتظام میں۔ لیکن غور کرو کہ اب ہمارے لئے دُنیا میں کیا کام باقی رہ

گیا ہے؟ حکومتیں باقی نہیں رہیں کہ اُن کے دبدبہ وسطوت
کا نقارہ بجائیں۔ دولت و ثروت کب کی جا چکی ہے اور
جو رہ گئی ہے۔ وہ بھی آتش زدہ ہے۔ نئی زمینوں پر قبضہ
کرنے کی فکر کیا کریں کہ جو چند گوشے اپنے ایام ذلّت و
نکبت بسر کرنے کے لئے باقی رہ گئے تھے اُن کے لائق
بھی نہ نکلے۔ تہذیب و تمدّن کی جگہ وحشت و جہالت ہمارا
پایۂ انسانیت سمجھا جاتا ہے اور دُنیا کی قوموں کی فہرست
میں ہمارے نام کے ساتھ "وحشی" اور "ناقابل حیات زندگی"
کے القاب لکھے جاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کی زمین پر رہنے
کے اب قابل نہیں رہے۔ ہم سے زمینیں چھین لینی چاہئیں
اور جس قدر جلد ممکن ہو۔ ہمارے بار ذلّت سے دُنیا کو
پاک کر دینا چاہیے۔ ہماری تیرہ سو برس کی تاریخ کے بعد
آج کل کی سرگذشت حیات صرف اتنی باقی رہ گئی ہے۔

گلگونہ عارض ہے نہ ہے رنگِ حنا تو
اے خوں شدہ دل تو تو کبھی کام نہ آیا

ہماری تمام متاع اقبال لُٹ چکی ہے۔ ایوان حکومت
کھنڈر ہے ہیں اور تخت شاہی اُلٹ گئے ہیں اب ہمارے
پاس کچھ باقی رہ گیا ہے۔ تو بس یہی چند مسجدوں کی محرابیں
ہیں اور چند عبادت گاہوں کے صحن اور یا پھر وہ گنبد سبز
جس کے نیچے دُنیا کا سب سے بڑا انسان سو رہا ہے*
لیکن آج ایڈریانوپل کی جامع سلیم کے صحن میں

بلغاریوں کے بوٹوں کی گرد اڑ رہی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کل اور کیا کچھ نہ ہوگا *

پھر اے وہ لوگو! کہ اپنے ایوان حکومت کی حفاظت نہ کر سکے۔ کیا آج خُدا کی عبادت گاہوں کی محرابوں اور اس کی صدائے توحید بلند کرنے کے مناروں کی بھی حفاظت نہ کر سکو گے؟

غفلت سرشت انسان کا قاعدہ ہے۔ کہ بہُت سی مصیبتیں اس کے لئے اس قدر جگر دوز اور زہرہ گداز ہوتی ہیں کہ اُن کا تصوّر بھی کرتا ہے تو کانپ اُٹھتا ہے لیکن پھر جب وقت آ جاتا ہے اور وہ مُصیبت سر پر آ کر کھڑی ہو جاتی ہے تو کچھ دیر تک متحیّر رہ کر کچھ دیر رو دھو کر اور کچھ دیر ماتم و فغاں سنجی کر کے آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور جس وقت کے تصوّر سے لرز جاتا تھا اس کو اس طرح جھیل جاتا ہے گویا کوئی واقعہ ہُوا ہی نہ تھا *

ایک مدّت سے ہم عالم اسلامی کے آخری مصائب کے تصوّر سے کانپ رہے ہیں۔ آخری وقت اور فیصلہ کُن وقت ہماری زبانوں پر ہے۔ ہم اس وقت کا ذکر کرتے تھے جب اعدائے اسلام ہمارے نیست و نابُود کرنے کے لئے اکٹھا ہو جائیں گے۔ ہم اس مصیبت کبریٰ کے خیال سے لرز اُٹھتے تھے۔ جب دشمن قسطنطنیہ کے دروازوں پر آ پہنچیں گے۔ ہم غافلوں کو ڈراتے تھے کہ ہوشیار ہوں کیونکہ

ایک وقت آنے والا ہے۔ جب آخری فیصلہ کی گھڑی سر پر آ جائے گی۔ ہم سوتوں کو جگاتے تھے کہ اُٹھ کھڑے ہوں۔ کیونکہ وہ "فزع اکبر" اور "طامۃ الکبریٰ" کا وقت کبھی نہ کبھی آنے والا ہے۔ جب کہ فنا و بقا اور موت و حیات کا فیصلہ آخری ہو جائے گا۔

پھر اگر آنکھیں کھول کر دیکھو تو اس وقت موعودہ اور مصیبت منتظرہ کا دن تو آ گیا۔ اور اگر اس کی آخری ساعت نہیں آئی ہیں۔ تو اس کو بھی دُور نہ سمجھو۔ لیکن کیا اپنی غفلت پیشگی کی عام عادت کی طرح اس بارے میں بھی ہمارا ویسا ہی حال ہوگا جیسا کہ ہر آنے والی مصیبت کے آ جانے کے بعد ہُوا کرتا ہے؟ کیا ہم اسے بھی جھیل جائیں گے؟ کیا چند آنسوؤں کی ریزش اور چند آہوں کی کشش سے اور کچھ نہ ہوگا؟ اور کیا پانی سر سے گذر جائے گا اور ہمارے ہاتھوں کو حرکت نہ ہوگی۔

خاک بدہنتم۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ وہ سب کچھ ہو گیا۔ جس کے ہونے میں اب کچھ دیر نہیں ہے۔ چشم تصور سے کام لو کہ جب آخری ساعت کے تصوّر سے ڈرتے تھے وہ مع اپنی آخری ہلاکتوں اور بربادیوں کے آ گئی۔ انگلستان نے عرب و عراق اور حجاز و حرمین کی ریاست کی دیرینہ آرزو پوری کر لی۔ شام پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ بقیہ ایشیا جرمنی کے زیر علم آ گیا۔ قسطنطنیہ

اور در دانیال کا بھی وہ حشر ہو گیا۔ جو مسئلہ مشرقی کے انفصال کے وقت سب سے پہلے ہو کر رہے گا۔ اور اپنی موت کی آخری خبر بھی ہم نے موجودہ جنگ کی خبروں کی طرح ریوٹر کی زبانی سُن لی۔ تو پھر بتلاؤ کہ اُس وقت اس کے سوا اور کیا ہوگا۔ جو کچھ کہ اس وقت ہو رہا ہے؟ کیا در و دیوار سے سر ٹکراؤ گے؟ کیا آبادیوں کو چھوڑ کر جنگلوں اور صحراؤں میں چلے جاؤ گے؟ کیا گنگا اور جمنا کی سطح تم کو اپنی آغوش میں لے جا کر بچائے گی؟ یا بحیرۂ عرب کی موجوں میں تمہیں پناہ مل جائے گی؟

اگر ایسا نہ ہوگا۔ تو پھر کیا دُنیا میں کوئی انقلاب عظیم ہو جائے گا؟ کیا آفتاب اپنے مرکز حرکت کو چھوڑ دیگا؟ کیا زمین حرکت سے معطل ہو جائے گی؟ کیا ستارے آپس میں ٹکرا جائیں گے؟

اگر یہ بھی نہ ہوگا تو کیا ہم رات کا سونا اور دِن کا کاروبار چھوڑ دیں گے؟ کیا کھانا پینا بالکل بند کر دینگے؟ اور کیا ہم کو زندگی کی احتیاج باقی نہیں رہے گی؟

حالانکہ ہم کو دُنیا کے اندر تبدیلی پیدا ہونے کی خواہش کا کیا حق ہے۔ جب ہم خود اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے؟

دُنیا اس طرح کبھی نہیں بدلی ہے اور وہ ہماری امیدوں اور ولولوں کی تابع نہیں۔ ایران نے بابل کو مسمار کر دیا۔

مگر آفتاب اسی وقت طلوع ہوا۔ جیسا کہ روز ہوتا تھا۔ سکندر نے ایران میں آگ لگا دی۔ مگر انسان نے اپنے گھروں کو اور صحرا کی چڑیوں نے اپنے آشیانوں کو نہیں چھوڑا۔ بابل و نینوا کے عظیم الشان تمدن برباد ہو گئے۔ مگر ان کی بربادی کے ماتم میں شاید کائنات کے ذرّے نے بھی زحمت نہ اٹھائی۔ یونان اور رومتہ الکبریٰ کے طلائی مندروں اور سنگی دارالعلوموں کی دیواریں سرنگوں تھیں اور اسکندریہ کے بیت العلم کا چراغ گُل ہو گیا تھا۔ مگر عرب کے شتر سواروں نے کب اس کی پروا کی اور اس انقلاب عظیم نے کب کاروبار عالم کو معطل کیا؟

اس کائنات ارضی کی گھڑی اپنے کیل پرزوں پر چل رہی ہے اور وہ ان حوادث و تغیرات سے بند نہیں ہو سکتی۔ بس اس کی تبدیلی کی خواہش بے فائدہ ہے۔ اس میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ ہماری خاطر اب ہوگی یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ البتہ ایک دنیا خود تمہارے اندر موجود ہے۔ سخت تعجب اور حیرت ہے۔ اگر ان حوادث و انقلاب سے خود اس کے اندر کوئی تبدیلی نہ ہو! اگر اس وقت نہ ہوگی تو پھر اور کس وقت کا انتظار ہے؟

ہماری ساری بدبختی اس میں ہے کہ ہم اپنی فتح و شکست کو ایڈریا نوپل کے سامنے ڈھونڈتے ہیں۔ حالانکہ اس کا اصلی میدان تو ہمارے دل کے اندر ہے۔ فی

انفسکم افلا تبصرون ؟ جب تک ہم خود اپنے اندر فتحیاب نہ ہوں گے ۔ اس وقت تک باہر بھی کامیاب نہیں ہو سکتے ۔ ہاں ایک وقت آنے والا تھا اور وہ آ گیا ۔ ایک یوم الفصل تھا ۔ جس کا آفتاب طلوع ہو گیا ۔ پرانی پیش گوئیوں میں کہا گیا تھا کہ آفتاب مغرب سے نکلے گا ۔ اور توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا ۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آفتاب مغرب سے نکل چکا ہے اور توبہ کا دروازہ (فقط مایۂ اُمیدواری ؍ مابد بختان عالم بود) روز بروز ہم پر بند ہو رہا ہے ۔ پس وقت آ گیا ہے ۔ کہ جس کو اُٹھنا ہے اُٹھے ۔ جس کو چلنا ہے چلے ۔ اور جس کو اپنے روٹھے ہوئے خدا سے صلح کر لینی ہے کر لے ۔ کیونکہ ساعت آخری ۔ نتائج سامنے ۔ مہلت قلیل اور فرصت مفقود ہے ٭

۱۳۔ یتیم شہزادہ کی عید

(شمس العلماء خواجہ حسن نظامی دہلوی)

خواجہ صاحب موجودہ عہد کے اہل قلم حضرات میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں آپ کی زبان اور طرز بیان کی دھوم ہے۔ آپ کی زبان دھلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ سادگی، برجستگی، روانی، شیرینی اور عام فہمی آپ کی زبان کی خصوصیات ہیں۔ زبان میں نزاکت اور رنگینی بھی بلا کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے اور ان میں صفائی اور چستی سے آپ کی تحریر میں شگفتگی اور تاثیر پیدا ہو جاتی ہے اسلوب بیان میں متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے مگر کہیں خشکی اور روکھا پن نہیں آنے پاتا۔

خواجہ صاحب کی پچاس ساٹھ تصنیفات شائع ہو کر شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر چکی ہیں۔

آپ کی اکثر تصنیفات مسلمانوں کی اندوہناک حالت سے

متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ غدر کے بعد خاندان مغلیہ کی بیگمات پر جو گذری اس کا بیان نہایت سوز و گذاز اور پُر تاثیر انداز میں کرتے ہیں۔ غمناک مناظر کے بیان میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے۔

آپ کے مختصر افسانے فطرت کی مصوری کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہیں۔ سوز و گذاز کا عنصر بھی ان میں ایک مخصوص انداز رکھتا ہے۔ آپ نے تخیلی مضامین اور تخیلی افسانے لکھ کر موجودہ انشا پردازوں میں ایک امتیازی شان پیدا کر لی ہے۔ آپ کے مضامین میں روحانیت ہر جگہ جلوہ فرما ہے۔ آپ نے لالٹین، دیا سلائی، برف وغیرہ پر مضامین لکھے ہیں۔ لیکن ان معمولی اور حقیر چیزوں کی آڑ میں آپ صوفیانہ اور اخلاقی نکات حل کرتے ہیں۔ آپ کو کائنات کے ذرّے ذرّے میں روحانیت نظر آتی ہے۔ اور جو اثر آپ کے دل پر مترتب ہوتا ہے اس کو عام فہم اور پُر تاثیر انداز میں پیش کر دیتے ہیں اور پھر اس کا لفظ لفظ عام پڑھنے والوں کے لئے درس معرفت بن جاتا ہے۔

(از تنویر ادب)

سنہ ۱۳۳۲ھ کی عید الفطر کا ذکر ہے۔ دہلی میں ۲۹ ر کا چاند نظر نہ آیا۔ درزی خوش تھے کہ ان کو ایک دن کام کرنے کو مل گیا۔ جوتے والوں کو بھی خوشی تھی کہ ایک روز کی بکری بڑھ گئی۔

مگر مسلمانوں کے ایک غریب محلّے میں تیموریہ خاندان کا ایک گھرانہ اس دن بہت غمگین تھا۔ یہ لوگ عصر سے پہلے اپنے گھر کے وارث میرزا دلدار شاہ کو دفن کر کے آئے تھے۔

دلدار شاہ دس دن سے بیمار تھے۔ ان کو پانچ روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی۔ گھر میں ان کی بیوی اور یہ خود کناری بنتے تھے۔ جس میں ان کو اتنی معقول آمدنی تھی کہ خوب آرام سے بسر اوقات کرتے تھے۔

اِن کے چار بچے تھے۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ دو لڑکیوں کی شادی ہو گئی تھی۔ ایک ڈیڑھ سال کی گود میں تھی اور ایک لڑکا دس برس کا تھا۔

دلدار شاہ اس لڑکے کو بہت چاہتے تھے۔ بیگم نے بہت چاہا کہ لڑکا مکتب میں جائے مگر دلدار شاہ کو بچّہ اس قدر لاڈلا تھا کہ اُنھوں نے ایک دن اس کو مکتب نہ بھیجا۔

لڑکا سارا دن گلیوں میں آوارہ پھرتا تھا۔ زبان پر گالیاں اس قدر چڑھ گئی تھیں کہ بات بات میں مغلظات بکتا تھا اور بادا جان اِس کی بھولی بھولی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔

میرزا دلدار شاہ بہادر شاہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ مرتے وقت اُن کی عمر پینسٹھ برس کی ہوگی۔ کیونکہ جب اُن کے

ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ ان کی عمر پچپن برس کی تھی۔ بڑھاپے کی اولاد سب کو پیاری ہوتی ہے۔ خاص کر بیٹا۔ میرزا دلدار شاہ جتنی محبّت کرتے تھوڑی تھی۔

ایک دن ان کے دوست نے کہا۔ صاحب عالم! بچّے کے لکھنے پڑھنے کی یہی عمر ہے۔ اب نہ پڑھیگا تو کب پڑھیگا لاڈ پیار بھی ایک حد تک اچھا ہوتا ہے۔ آپ اس کے حق میں کانٹے بوتے ہیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ ایک دن سب کو مرنا ہے خدانخواستہ آپ کی آنکھیں بند ہوگئیں تو اس معصوم کا کہیں ٹھکانہ نہ رہے گا۔ لکھ پڑھ لے گا تو دو روٹیاں کما کھائے گا۔ اس زمانے میں شریفوں کی گذران بڑی دُشوار ہوگئی ہے۔ کچھ آئندہ کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کو غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑے اور بزرگوں کی ناک کٹے۔ میرزا دلدار شاہ اس ہمدردی سے بگڑ گئے اور بولے آپ میرے مرنے کی بدشگونی کرتے ہیں۔ ابھی میری کون سی ایسی عمر ہوگئی ہے۔ لوگ تو سو برس تک زندہ رہتے ہیں۔ رہا بچے کا پڑھانا سو میرے نزدیک تو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ بڑے بڑے بی۔ اے پاس مارے مارے پھرتے ہیں اور دو کوڑی کو کوئی نہیں پوچھتا۔ میرا بچّہ پہلے ہی دھان پان ہے۔ آئے دِن کا مریض ہے۔ میرا دل گوارا نہیں کرتا۔ کہ

ظالم اُستادوں کے حوالے کر کے اس کی نازک ہڈّیوں کو قمچیوں کا نشانہ بنواؤں۔ جب تک میرے دم میں دم ہے۔ عیش کراؤں گا۔ میں نہ رہوں گا۔ تو خدا رزاق ہے۔ وہ چیونٹی تک کو کھانا پہنچاتا ہے۔ پتھّر کے کیڑے کو رِزق پہنچاتا ہے۔ آدمی کے بچّے کو کہیں بھوکا مارے گا؟ میاں ہم نے زمانہ کا بڑا گرم سرد رنگ دیکھا ہے۔ ہمارے ماں باپ نے بھی ہم کو نہ پڑھایا۔ تو کیا ہم بھُوکے مرتے ہیں*

نصیحت کرنے والے بچارے یہ جواب سُن کر چُپ ہو گئے۔ اور دل ہی دل میں پچھتائے کہ ناحق ان سے درد مندی کی بات کہی۔ لیکن انہیں خیال آیا۔ کہ حق بات کہنے سے چُپکا رہنا گناہ ہے۔ الساکت عن الحق الشیطان اخرس۔ سچّی بات کہنے سے خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے۔ انھوں نے پھر کہا کہ جناب آپ ناراض نہ ہوں۔ مَیں خدا نخواستہ آپ کا مرنا نہیں چاہتا میں نے دُور اندیشی کی بات کہی تھی۔ آپ کو ناگوار گذری تو معاف فرمائیے مگر یہ تو خیال فرمائیے کہ آپ کے بچپن میں اور حالت تھی۔ اور آج کل اور زمانہ ہے۔ اس وقت قلعہ آباد تھا۔ جہاں پناہ ظلِّ سجانی بہادر شاہ حضرت کا سایہ سر پر تھا۔ ہر بات سے بے فکری تھی۔ لیکن آج تو کچھ بھی نہیں۔ نہ بادشاہی ہے نہ امیری ہے

ہر مسلمان کے گھر میں گدائی اور فقیری ہے۔ اب تو جو ہُنر مندی سیکھے گا اور اپنی روٹی اپنے بازوؤں سے کمائے گا۔ وہی لالوں کا لال بنے گا۔ ورنہ ذلّت و خواری کے سوا کچھ نہ ہاتھ آئے گا۔

دلدار شاہ نے کہا۔ ہاں یہ سچ ہے۔ میں اس کو سمجھتا ہوں۔ مگر آخر ہماری بھی تو اتنی عمر اس بربادی کے زمانے میں بسر ہو گئی۔ سرکار نے پانچ روپیہ کی جو پنشن مقرّر کی ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس میں ہمارے کیسے وقت نکلتے ہوں گے۔ آٹھ آنے روز تو بچّہ کا خرچ ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی روپے اور ڈیڑھ روپے کی روز کناری بنتے ہیں اور مزے سے گذر اوقات کرتے ہیں۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اور صاحب تشریف لائے اُنھوں نے کہا کہ آسٹریا کے بادشاہ کا ولی عہد مارا گیا۔ جب بادشاہ کو اس کی خبر پہنچی تو وہ بے قرار ہو گیا اور ہائے کا نعرہ مار کر کہا۔ ظالموں نے سب کچھ لُوٹ لیا۔ میرے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا۔

میرزا دلدار شاہ یہ سُن کر ہنسنے لگے اور بولے بھئی واہ اچھّی بہادری ہے کہ بیٹے کے ناگہانی مرنے سے ایسے گھبرا گئے۔ میاں جب بہادر شاہ حضرت کے صاحبزادہ سے میرزا مُغل وغیرہ گولی سے مارے گئے اور اُن کے سر کاٹ کر سامنے لائے۔ تو بادشاہ نے

خوان میں کٹے ہوئے سر کو دیکھ کر نہایت بے پروائی سے فرمایا۔ الحمدللہ سرخرو ہو کر سامنے آئے۔ مرد لوگ اسی دن کے لئے بچے پالتے ہیں +

جو صاحب خبر لائے تھے وہ بولے کیوں جناب غدر میں آپ کی کیا عمر ہو گی۔ میرزا دلدار شاہ نے کہا۔ کوئی چودہ پندرہ برس کی۔ مجھے سب واقعات اچھی طرح یاد ہیں۔ بادا جان ہم کو لے کر غازی آباد جا رہے تھے کہ ہینڈن ندی پر ہم کو فوج نے پکڑ لیا۔ والدہ اور میری چھوٹی بہن چیخیں مار کر رونے لگیں والد نے اُن کو منع کیا اور آنکھ بچا کر ایک سپاہی کی تلوار اُٹھا لی۔ تلوار ہاتھ میں لینی تھی کہ سپاہی چاروں طرف سے ان پر ٹوٹ پڑے۔ اُنہوں نے دو چار کو زخمی کیا۔ مگر سنگینوں اور تلواروں کے اتنے وار اُن پر ہوئے کہ بیچارے قیمہ قیمہ ہو کر گر پڑے اور شہید ہو گئے +

اُن کی شہادت کے بعد سپاہیوں نے میری بہن اور ماں کے کانوں کو نوچ لیا اور جو کچھ اُن کے پاس تھا۔ چھین کر چلتے ہوئے۔ انہوں نے مجھ کو قید کر کے ساتھ لے لیا +

جس وقت میں والدہ سے جُدا ہؤا ہوں اُن کی آہ وزاری سے آسمان ہلا جاتا تھا وہ کلیجہ کو تھامے ہوئے

چیختی تھیں اور کہتی تھیں :-

"ارے میرے لال کو چھوڑ دو۔ تم نے میرے سرتاج کو خاک میں ملا دیا سُلا دیا۔ اس یتیم پر تو رحم کرو۔ میں رنڈیا کس کے سہارے رنڈاپا کاٹوں گی۔ اللہ میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔ میرا دلدار کہاں جاتا ہے۔ کوئی اکبر و شاہجہاں کو قبر سے بُلائے۔ اُن کے گھرانے کی دُکھیا کی بپتا سُنائے۔ دیکھو میرے دل کے ٹکڑے کو مٹھی میں مسلے دیتے ہیں۔ ارے کوئی آؤ۔ میری گودیوں کا پالا مجھ کو دلواؤ"۔

چھوٹی بہن آکا بھائی کہتی ہوئی میری طرف دوڑی مگر سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیئے۔ اور مجھ کو باگ ڈور سے باندھ لیا۔ گھوڑے دوڑتے تھے تو مَیں بھی دوڑتا تھا۔ پاؤں لہو لہان ہو گئے تھے۔ دل دھڑکتا تھا۔ دم اکھڑا جاتا تھا۔

پوچھا۔ میرزا یہ بات رہ گئی کہ پھر تمہاری والدہ اور بہن کا کیا حال ہؤا ؟

میرزا نے کہا۔ آج تک ان کا پتہ نہیں لگا۔ خبر نہیں اُن پر کیا گذری اور وہ کہاں گئیں۔ مجھ کو سپاہی اپنے ہمراہ دہلی لائے اور یہاں سے اندور لے گئے۔ مجھ سے گھوڑے ملواتے تھے اور گھوڑوں کی لید صاف کراتے تھے۔

چند روز بعد مجھ کو چھوڑ دیا گیا۔ اور میں نے اندور میں ایک ٹھاکر کے ہاں دربانی کی نوکری کر لی۔ کئی برس اس میں گذارے۔ پھر دہلی میں آیا اور سرکار میں درخواست دی۔ اس کی مہربانی سے میری بھی اوروں کی طرح پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے شادی کی۔ یہ بچّے پیدا ہوئے۔ اس واقعے کے بعد میرزادہ دلدار شاہ بیمار ہوئے اور دس دن بیمار رہ کر آخرت کو سِدھارے۔

اُن کے مرنے کا غم سب سے زیادہ اُن کی بیوی اور لڑکے کو تھا۔ لڑکا دس برس کا تھا اور اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ابّا جان مر گئے ہیں۔ مگر وہ بار بار اماں سے کہتا تھا کہ ابّا جان کو بلا دو۔

الغرض اس رونے دھونے میں یہ سب لوگ سو گئے۔ سحری کو بیگم صاحبہ بیدار ہوئیں۔ تو دیکھا کہ گھر میں جھاڑو پھری ہوئی ہے۔ کپڑا۔ لتّا۔ برتن۔ بھانڈا سب چور لے گئے۔ بیچاری بیوہ نے سر پیٹ لیا۔ ہے ہے اب مَیں کیا کروں گی۔ میرے پاس تو ایک تنکا بھی نہ رہا۔ گھر کے مالک کے اُٹھتے ہی چوری بھی ہوئی۔

آس پاس کے محلّے والے اِن کے رونے کی آواز سُن کر جمع ہوئے اور سب نے بہت افسوس کیا۔ پڑوس میں ایک گوٹے والے رہتے تھے۔ انہوں نے سحری کے

لئے دودھ اور نان پاؤ بھیجا۔ اور بیچاری نے ٹھنڈا سانس بھر کے اس کو لے لیا۔ یہ پہلا دن تھا کہ بیوہ شہزادی نے خیرات کی سحری کھائی۔ جس کا اس کو سب سے زیادہ صدمہ تھا۔ دِن ہُوا۔ چاروں طرف عید کے سامان نظر آتے تھے۔ چاند رات کی چہل پہل ہر گھر میں تھی مگر وہ تھی تو اُس گھر میں جہاں دُودھ پیتی بچّی کو گود میں لئے بیوہ شہزادی یتیم شہزادے کو سمجھا رہی تھی کیونکہ وہ نئی جوتی اور نئے کپڑے مانگتا تھا۔ ماں نے کہا:-

"بیٹا تمہارے ابّا جان پردیس گئے ہیں۔ وہ آ جائیں تو کپڑے منگا دیں گے۔ دیکھو تمہارے دولھا بھائی بھی بنارس گئے ہوئے ہیں۔ وہ ہوتے تو اُن سے ہی منگا دیتے۔ اب کس کو بازار بھیجُوں"

لڑکے نے کہا۔ میں خود لے آؤں گا۔ مجھ کو دم دو۔ دام کا نام سُن کر دکھیاری بیوہ کے آنسو آ گئے۔ اُس نے کہا۔ تمہیں خبر نہیں۔ رات کو گھر میں چوری ہو گئی۔ ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔

ضدی شہزادے نے مچل کر کہا۔ نہیں مَیں تو ابھی لوں گا۔ یہ کہ کر دو چار گالیاں ماں کو دیں۔ مصیبت زدہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر آسمان کو دیکھا۔ اور بولی اچھا ٹھیرو۔ میں منگاتی ہوں۔ یہ کہ کر پڑوس کے

گھر سے لگی ہوئی کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو۔ اور گوٹے والے کی بیوی سے کہا۔ بُوا! عدت کے دن ہیں۔ میں اندر تو نہیں آ سکتی۔ ذرا میری بات سُن جاؤ۔ وہ بیچاری فوراً اُس کے پاس آ گئی۔ تو اُسے سارا ماجرا سُنایا اور کہا کہ خدا واسطے کا کام ہے۔ اپنے بچّے کی اُترن کوئی جُوتی اور کپڑوں کا جوڑا ہو تو ایک دن کے لئے مانگے دے دو۔ کل شام کو واپس دے دُوں گی +

شہزادی اُترن کہتے وقت بے اختیار ہچکی لے کر رونے لگی۔ پڑوسن کو بڑا ترس آیا۔ اُس نے کہا۔ بُوا رونے اور جی بھاری کرنے کی کچھ بات نہیں۔ ننھّے کی کئی جوتیاں اور کئی جوڑے فالتو رکھے ہیں۔ ایک تم لے لو۔ اِس میں اُترن کا خیال نہ کرو۔ اُس نے تو ایک دن یُونہی ذرا پاؤں میں ڈالی تھی۔ میں نے منگوا کر رکھ دی +

یہ کہ کر پڑوسن نے جُوتے اور کپڑے شہزادی کو دئے شہزادی یہ چیزیں لے کر بچّے کے پاس آئی اور اُس کو یہ چیزیں دکھائیں۔ بچّہ خوش ہو گیا +

دوسرے دن عید گاہ جانے کے لئے شہزادی نے اپنے بچے کو بھی گوٹے والے پڑوسی کے ساتھ کر دیا۔ عید گاہ پہنچ کر یتیم شہزادہ نے گوٹے والے کے لڑکے سے کہا۔ ابے تیری ٹوپی سے ہماری ٹوپی اچھّی ہے۔ گوٹے

والے کے لڑکے نے جواب دیا۔ چل بے اُترن گھترن پر اِتراتا ہے۔ ابے یہ بھی میری ٹوپی ہے۔ امّاں نے خیر خیرات دے دی ہے۔

یہ سنتا تھا کہ شہزادہ نے ایک زور کا تھپّڑ گوٹے والے بچّے کے مارا اور کہا۔ "ہم کو خیرات خورہ کہتا ہے"۔ گوٹے والے نے جو اپنے بچے کو پٹتا دیکھا تو اُس کو بھی غصّہ آگیا اور اُس نے دو تین طمانچے شہزادے کے مارے۔ یہ لڑکا روتا دھوتا بھاگا۔ گوٹے والے نے خیال کیا کہ اُس کی ماں کیا کہے گی کہ ساتھ لے گئے تھے۔ کہاں چھوڑ آئے۔ اس لئے وہ اُس کے پکڑنے کو دوڑا۔ مگر لڑکا نظروں سے غائب ہو گیا۔ ناچار گوٹے والا مجبور ہو کر اپنے گھر چلا آیا۔

اب شہزادہ کی یہ کیفیت ہوئی کہ عام خلقت کے ساتھ عید گاہ سے گھر کی طرف آ رہا تھا کہ راستے میں ایک گاڑی کی جھپٹ میں آ کر گر پڑا اور زخمی ہو گیا پولیس شفا خانے لے گئی۔

یہاں گھر میں اُس کی ماں کا عجب حال تھا۔ غش پہ غش آتے تھے۔ دو وقت سے بھوکی تھی۔ اس پر عید اور یہ مُصیبت کہ لڑکا گُم ہو گیا اور عالم یہ کہ کوئی پُرسان حال نہیں جو لڑکے کو تلاش کرنے جائے آخر وہی بیچارہ گوٹے والا پھر گیا اور پولیس میں اطلاع

لکھوائی۔ اس وقت معلوم ہوا جبکہ وہ شفا خانے جا کر خبر لایا اور شہزادی کو ساری کیفیت سنائی۔ اس وقت عجیب عالم تھا +

عید کی شام تھی۔ گھر گھر خوشیاں منائی جا رہی تھیں مبارکبادوں کے چرچے تھے۔ تحفے تحائف اور عیدیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ ہر مسلمان نے اپنی حیثیت سے زیادہ گھر کو آراستہ کیا تھا اور اپنے بال بچوں کو خوش و خرم لئے بیٹھا تھا۔ مگر بیوہ شہزادی دو وقت کے فاقے سے رنجور۔ بچہ کے غم میں اشکبار۔ اندھیرے۔ اُجاڑ گھر میں بیٹھی آسمان کو دیکھتی تھی "خدایا میری عید کہاں ہے" اور بے اختیار ہچکیاں لے کر روتی تھی۔ اُدھر شفاخانے میں یتیم شہزادہ اماں کی جدائی میں پھڑکتا تھا +

۱۴۔ مرحوم اصغر گونڈوی

رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو ادب کے پروفیسر اور دنیائے ادب میں مشہور مقبول انشا پرداز اور ایک خاص رنگ کے موجد اور مالک ہیں۔ آپ کے مضامین کے چند مجموعے اور ایک مزاح نگاری کی تاریخ شائع ہو چکی ہے۔

رشید صاحب کے مضامین میں شستہ ظرافت ہوتی ہے جو زیادہ تر رمز و کنایہ سے پیدا کی جاتی ہے۔ لفظ ظرافت یا مزاح آجکل خاصہ بدنام ہو چکا ہے۔ اس کو سنتے ہی اکثر وہ مضامین ذہن میں دوڑنے لگتے ہیں جنکی ظرافت پھکڑ بازی سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔ اور جن میں مضمون نگار خود تماشا بن کر پڑھنے والوں کو ہنسنے ہنسانے کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن رشید صاحب کی ظرافت "متین و سنجیدہ ظرافت" ہوتی ہے۔

آپ کے مضامین عام فہم نہیں ہوتے۔ آپ اپنے مضامین میں ایک خاص ماحول پیدا کرتے ہیں۔ یہ ماحول زیادہ تر تاریخی، سیاسی، اخباری معلومات اور کسی قدر مخصوص علی گڑھی روایات کا حامل ہوتا ہے جو لوگ اس ماحول سے مناسبت نہیں رکھتے وہ آپکی ظرافت سے کچھ لطف نہیں اٹھا سکتے۔ آپ کی زبان بھی مشکل اور خاص فہم ہوتی ہے۔ عربی و فارسی الفاظ و تراکیب بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اکثر ان ہی الفاظ و تراکیب میں "موج تبسم" پنہاں ہوتی ہے ادبیت و صحت آپ کی عبارت کا جوہر ہے۔

رشید صاحب نے خالص مزاحیہ مضامین کے علاوہ چند مفید تنقیدی مضامین یا مقدمے بھی لکھے ہیں علاوہ ازیں "گنج ہائے گرانمایہ" کے نام سے آپ کی ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں آپ نے چند مشاہیر اصحاب و احباب کے گویا منثور مراثی لکھے ہیں۔ اسی کتاب میں سے ایک مضمون "مرحوم اصغر گونڈوی" یہاں درج کیا جاتا ہے۔

ان مضامین کی زبان و اسلوب بیان کا کیا کہنا۔ ان مضامین میں رشید صاحب نہ تو محض مزاح نگار ہیں نہ سنجیدہ اور خشک انشا پرداز۔ بلکہ آپکے اسلوب بیان میں وہ متانت و سنجیدگی ہے جس کو

آپ کی فطری شوخی اور شگفتگی طبع نے بے انتہا پُر لطف اور دلکش بنا دیا ہے۔ واقعات کی جزئی تفصیلیں اس بے تکلفی سے دیتے چلے جاتے ہیں کہ واقعہ تصویر بن کر نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور اس میں جابجا شوخی کی رنگ آمیزی سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے۔

حقیقت ہے کہ رشید صاحب کا اسلوب بیان اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہے۔

انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے
اک حُسن کی دُنیا ہے خاکستر پروانہ

دُنیا کی بھلی یا بُری باتیں دُنیا کے بھلے یا بُرے لوگوں سے ثابت ہوتی ہوں یا نہیں سمجھ میں اسی طرح آتی ہیں ماں باپ بھائی بہن احباب سب کی محبت میری سمجھ میں تو اپنے ہی ماں باپ بھائی بہن اور دوستوں کی محبت سے آئی۔ اصغر صاحب مرحوم میں جو خوبیاں تھیں ممکن ہی نہیں یقین ہے دوسروں میں بھی ہونگی لیکن مجھے وہ خوبیاں اس لئے زیادہ عزیز تھیں کہ وہ اصغر صاحب کی خوبیاں تھیں جنکی ذات نے انکو عزیز و گرامی تر بنا دیا تھا

اصغر صاحب مرحوم سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۵ء کے جاڑوں میں مدرسۃ العلوم کی پچاس سالہ جوبلی کے موقع پر علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ

مولانا اقبال احمد صاحب سہیل (علیگ) ہی کے توسل سے ہوئی۔ جنہوں نے ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ء میں کرائی تھی۔ اس وقت تک میں اصغر صاحب کی ذات یا کلام دونوں سے ناآشنا تھا۔ مولانا سہیل سے البتہ پرانی یاد اللہ تھی۔ رات کے آٹھ بجے تھے مولانا اور اصغر صاحب ساتھ ہی میرے مکان پہ تشریف لائے۔ میں گھر میں تھا۔ سہیل صاحب کی اطلاع ہوئی تو میں بے اختیار باہر آیا اور بہت سے غیر ذمہ دارانہ فقرے کچھ اوہورے کچھ پورے وردِ زبان کرتا آیا۔ اس لئے کہ میں نے مولانا سہیل جیسا بے پناہ برجستہ گو اور دقیقہ سنج آدمی اب تک نہیں دیکھا ہے۔ وہ عالمانہ نکتوں اور فقروں کو اس لطف و وضاحت کے ساتھ ایک دوسرے میں "سموئے" ہوئے برمحل و مسلسل چُست کرتے چلے جاتے ہیں کہ طبیعت عش عش کر جاتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ اُنھوں نے پہل کر دی تو ان کا قابو میں لانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس لئے میں گھر سے تیار ہو کر نکلا تھا۔

میں کچھ کہنے والا تھا کہ سامنے ایک صاحب نظر آئے کمرہ چھوٹا تھا۔ دروازہ بند اور روشنی مدھم۔ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اجنبی کے قدوقامت کے مقابلے میں کمرے کی وسعتیں لحظہ بلحظہ سمٹتی جا رہی ہیں۔ دراز قد۔ بھنوٹ سے جسم۔ ستھری و خوش قطع پوشاک۔ سر پر بے ٹ۔

سڈول بھری بھری فرنچ کٹ داڑھی سر پر بالوں کی اونچی ٹوپی۔ چہرہ پر اُجالا۔ آنکھوں میں خلوص کی گہرائی اور ذہانت کی شگفتگی تیور میں شرافت۔ متوسط عمر۔ انداز میں خود اعتمادی و دل آسائی۔ بہیک نظر دل نے گواہی دی کہ اچھے آدمی سے ملاقات ہوئی یہ اصغر صاحب مرحوم تھے۔

اصغر صاحب کسی قدر جھکے ہوئے تھے۔ جھکنا ایسا تھا جیسے کوئی بڑا آدمی بڑائی بھلمنساہٹ سے جھک گیا ہو۔ یہ جھکاؤ اعضا کا نہیں انداز کا جھکاؤ تھا۔ مسکرانا ایسا جیسا کسی واقعہ پر نہیں مسکرا رہے ہیں بلکہ تبسم انکی شخصیت کا وجود تھا۔ ان کا مسکرانا نہ تھا بلکہ چہرے کی فضا ہی ایک مستقل شگفتگی تھی۔ مولانا سہیل سے میں بے تکلف ہی نہیں گستاخ بھی تھا۔ مولانا بولے۔ یلو۔ ایک انسان لایا ہوں۔ میں نے کہا شکر ہے۔ آپ نے محسوس تو کیا کہ آپ کے ساتھ انسان کا وقتاً فوقتاً رہنا بہت ضروری ہے۔ بولے۔ یلو یلو اصغر صاحب ہیں۔ اصغر صاحب مسکرا کر آگے بڑھے اور بغل گیر ہو گئے اور میں نے کچھ ایسا محسوس کیا جیسے محبت و مرحمت کے لمس نے مجھے کشش ثقل سے آزاد کر دیا ہو۔

مولانا سہیل نے اتنی فرصت غنیمت سمجھی اور اپنے بندھے ہوئے بستر پر بیٹھ گئے پاس ہی لوٹا تھا اُسے اس طور پر اُٹھالیا جیسے میرے ہاتھ اسے بجنے والے

تھے۔ مجھ سے اصغر صاحب کے بکس پر بیٹھنے کو کہا۔ اور ابھی میں بیٹھنے کیا سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ بولے سنو اصغر صاحب کا ایک شعر سناتا ہوں۔ ابھی شعر کی باری نہیں آئی تھی کہ بولے اصغر صاحب میں کسر یہ رہ گئی کہ ذاکر نہیں ہیں ورنہ دیکھئے کیا لطف آتا۔ پھر ایک خاص ترنم سے پیشہ وروں کے نہیں بلکہ بھلے مانسوں کے ترنم میں پڑھا۔

رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

مولانا سہیل شعر کے بڑے اچھے پارکھ ہیں۔ ذاکر صاحب اچھے شعر سن کر نئی اور اچھوتی دُنیائیں بنا دینے میں کمال رکھتے ہیں۔ میں کسی میں نہیں لیکن اچھا شعر مجھ پر کچھ ایسا ہی اثر کرتا ہے جیسے اچھا کام کرنے سے خوشی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتا کہ مجھ پر شعر کا کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ جو میں نے بتایا ہے وہ محض مثال کے طور پر ہے۔ اور مثال پر مجھے بھروسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ دُنیا میں سارا جھگڑا اسی مثال کا سہارا لینے سے پیدا ہوا ہے۔

میں نے کہا مولانا شعر بڑے مزے کا ہے للہ اسے بکس و بستر پر بیٹھ کر اور لوٹا ہاتھ میں لے کر غارت نہ کیجئے

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے کھانا آیا۔ مولانا نے فرمایا اصغر صاحب ذرا روح نشاط تو نکالنا۔ ان کو اشعار سناؤں میں نے عرض کیا مولانا ذرا چھری تلے دم لینے دیجئے۔ جاڑا پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی آتی ہے کھانا کھاکر چائے کا دور ہوگا پھر جھوٹ سچ ملایا جائیگا آپ تو اشعار کا بیوپار کرتے ہیں اس سے اصغر صاحب کی دنیا اور میری عاقبت خراب ہوتی ہے۔ آپ کا کیا۔ نہ دنیا کے قابل نہ عقبیٰ کے قائل! مولانا ایک خاص انداز سے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسے دونوں پاؤں گھٹنوں سے موڑ کر کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے جھولا سا جھولنے لگے۔ یہ مولانا کے ابتہاج و اہتزاز کی خاص علامت ہے۔

ناظرین معاف فرمائیں ابتہاج و اہتزاز ایسے الفاظ استعمال کرنے میں مجھے کبھی اور ضرور تامل ہوتا۔ لیکن جب بھلے مانس اور سمجھ دار موجود ہوں تو الفاظ دقیق ہوں خواہ غیر مانوس۔ ان کے برمحل و بے تکلف استعمال کرنے میں ذوق کو تسکین ہوتی ہے۔ جاہلوں اور لیڈروں کے اس دور میں دقیق یا نازک مضمون کو موزوں و مکمل ادا کرنے کو ترس گیا۔ انہوں کو کون سمجھائے کہ صاحب ذوق عربی۔ فارسی یا کسی اور زبان کے الفاظ قابلیت کی نمائش یا تعصب کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ مافی الضمیر کو آسانی سے منقح کرنے کے لئے۔ عوام یا لیڈر کی سمجھ میں وہ لفظ

ورنہ پھندہ لگنے کا اندیشہ ہے۔ میں نے کہا رند نے ظرف تو اٹھا لیا لیکن ابھی ساغر بننا باقی ہے۔ اس کے بعد پینے اور میخانہ بننے کا سوال آئیگا۔ مجھے تو یہ دیکھنا ہے کہ اصغر صاحب نے جو شعر کہا ہے اسے وہ ہماری دنیا میں آباد بھی کر سکتے ہیں کہ نہیں متاع یوسفی مسلّم۔ لیکن دام تو مصر ہی کے بازار میں لگیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں میرے آپ جیسے ناگفتنی موجود ہوں وہاں اصغر صاحب ساغر و میخانہ کی فضا بھی پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اصغر صاحب ہنس پڑے کہنے لگے رشید صاحب ساغر و میخانے کی فضا شاعر نہیں پیدا کرتے کلال پیدا کرتے ہیں۔ شاعر تو شرافت و شہامت کا اعلان کرتا ہے۔ مسجد۔ میخانہ یا میدان مصاف کا انتخاب تو ہر شخص اپنے اپنے ظرف سے کرتا ہے۔ علی گڑھ میں ساغر و میخانہ کی کیا کمی۔ کمی تو رندوں کی ہے۔ میں نے کہا ٹھیک فرمایا۔ لیکن یہ تو بتائیے۔ مولانا سہیل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہنے لگے ان کی نہ پوچھیے تمام عمر میخانے میں رہے نکلے تو محتسب بن گئے۔ میں نے کہا محتسب ہی نہیں گداہ سرکاری بھی۔ علی گڑھ سے نکل کر ان کا یہ حشر ہوا۔ نکالے گئے ہوتے تو یقیناً رند ہوتے۔ مولانا بولے نکالا جاتا تو تمہارا کیا حشر ہوتا۔ میں نے کہا وہی جواب

نہ آئے تو ہم خوش اور ہمارا خدا خوش۔ ہم کب چاہتے
ہیں کہ آپ بڑے احمق اور جاہل بھی ہوں۔ ۔
اور ہمارے جواہر پاروں سے کھیلنے بھی دئے جائیں۔
عوام کو خوش کرنا بڑے ثواب کی بات ہے۔ لیکن
کوئی موقع تو ایسا ملنا چاہئے جب ہم اپنا اور اپنوں کا
جی اپنے طور پر خوش کر سکیں۔

سب لوگ اطمینان سے بیٹھے ایسے موقع پر اطمینان
سے بیٹھنے کے معنی اپنے اپنے بستر پر لحاف اوڑھ کر
لیٹ جانے اور جس کے جی میں جو آئے کہہ گذرنے
کے ہیں۔ نہ قوم کے تباہ ہونے کی پروا اور نہ زندگی
کے فانی ہونے کا غم۔ آواز دی۔ اندر سے پان آگئے
انگیٹھی سرد ہونے لگی۔ نوکر نے کوئلے ڈال دیئے۔ نہ
اندر سے کسی کے بلانے کی ہمت نہ باہر سے کسی صاحب
کے آنے کا خطرہ نیند آئی سو گئے۔ جی چاہا بستر پر ہی
رقص کرنے لگے۔

مولانا سہیل نے فرمایا۔ اچھا اصغر صاحب روح
نشاط تو نکالئے۔ مرحوم نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے
آپ کو تو یونہی سب کچھ حفظ ہے۔ میں نے کہا مولانا
ذرا ٹھہرئیے۔ ابھی پہلا ہی شعر حلق سے نیچے نہیں اترا
ہے۔ مولانا نے نہایت متانت سے فرمایا۔ جلدی کیجیے

اصغر صاحب کا ہے۔ اس پر مولانا اور اصغر صاحب دونوں نے قہقہہ لگایا۔

دوسرے دن اصغر صاحب نے نشاطِ رُوح کا ایک نسخہ بڑی محبت سے دیا۔ کئی دن بعد مرحوم نے پُوچھا آپ نے نشاطِ رُوح کا مطالعہ بھی کیا۔ میں نے کہا اصغر صاحب اس وقت مولانا سہیل موجود نہیں ہیں۔ آپ خود کچھ متفرق اشعار سُنایئے۔ یہ شخص بلائے بے درماں ہے۔ شعر سے لُطف اُٹھانے نہیں دیتا۔ سوچنے کے چکّر میں ڈالدیتا ہے۔ وہ دیکھئے احاطہ کے پھاٹک پر کسی بُزاخفش سے اُلجھا ہوا ہے۔ یقیناً اس سے وہ باتیں بیان کر رہا ہوگا جو افلاطون وارسطو سے کرنا چاہیے تھیں۔ اصغر صاحب نے فرمایا۔ متفرق اشعار نہ سُناؤنگا پوری غزل سُنئے۔ شاعر کو اسی طرح سُننا چاہیئے تصوّر سے ہمکنار ہوجئے۔ تصویر دیکھ کر کیا کیجئے گا۔ پھر یہ غزل سُنائی کیسا نرم پُر تمکین و گورا لہجہ تھا۔

گلوں کی جلوہ گری مہرو مہ کی بوالعجبی
تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی
گذر گئی ترے مستوں پہ وہ بھی تیرہ شبی
نہ کہکشاں نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی
یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے
جمال دوست و شب ماہ و بادۂ عنبی

فروغِ حُسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادائے رسم بلالی و طرزِ بولہبی
سرشتِ عشق طلب اور حُسن بے پایاں
حصولِ تشنہ لبی ہے شدید تشنہ لبی
وہیں سے عشق نے بھی شورشیں اُڑائی ہیں
جہاں سے تو نے لئے خندہ ہائے زیر لبی
کشش نہ جام نگاریں کی پُوچھ اے ساقی
جھلک رہا ہے مرا آب و رنگ تشنہ لبی

دس گیارہ سال ہوئے ایک دفعہ ایسا بیمار پڑا کہ زندگی کے لالے پڑ گئے لکھنؤ میڈیکل ہسپتال میں مدتوں صاحب فراش رہا۔ اس زمانہ میں اصغر صاحب الہ آباد میں تھے۔ تقریباً ہر اتوار کو میں ہسپتال کے بالا خانہ پر اپنے کمرے کے قریب ٹھیک نو بجے دن کو پاؤں کی ایک خاص آہٹ سُنتا۔ دروازہ کھلتا + اصغر صاحب آہستہ آہستہ لیکن مستقل اور ہموار قدموں سے کمرہ میں مسکراتے ہوئے داخل ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ کچھ دیکھ کر یا محسوس کرکے خوش ہو رہے ہیں۔ سلام وعلیکم اس لہجہ و انداز سے کرتے جیسے کوئی خوشخبری سُنا رہے ہیں۔ کُرسی پر بیٹھ جاتے مجھ سے تو کیا کسی اور سے بھی نہ پوچھتے کہ کیسا ہوں یا کیا ہو رہا ہے۔

بات اس انداز سے کرتے جیسے مجھے دیکھنے کے لئے کوئی لمبا سفر کرکے نہیں آئے۔ بلکہ ہسپتال تک ٹہلنے کے لئے آئے تھے۔ میری طرف بھی آنکلے۔ باتیں ایسی چھیڑتے جن کا تعلق دُور دُور تک بھی مرض یا ہسپتال سے نہ ہوتا۔

اسی زمانہ میں میرا ایک مضمون "شیطان کی آنت" شائع ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پوچھا اصغر صاحب یہ آپ ہر ہفتہ الہ آباد سے یہاں کیوں آتے ہیں۔ اور زحمت و بیزاری اٹھاتے ہیں۔ کچھ سوچا پھر مسکرا کر بولے "شیطان کی آنت" کھینچ لاتی ہے۔ میں نے کہا فرشتوں کو بھی!۔ فرمایا کہ فرشتہ کو شیطان ہوجاتے بھی تو آپ نے سُنا ہوگا! میں نے کہا اصغر صاحب کچھ تکلیف نہ ہو تو کچھ سُنائیے اصغر صاحب میری اس غالباً غیر متوقع فرمائش پر بہت مسرور ہوئے اور ذیل کی غزل بڑے لطف سے سُنائی۔

سرگرم تجلّی ہو اے جلوۂ جانانہ
اُڑ جائے دھُواں بن کر کعبہ ہو کہ بُت خانہ

یہ دین وہ دُنیا ہے یہ کعبہ وہ بُت خانہ
اک اور قدم بڑھ کر اے ہمتِ مردانہ

قربان ترے میکش ہاں اے نگہ ساقی
تو صورتِ مستی ہے تو معنیٔ مے خانہ

اب تک نہیں دیکھا ہے کیا اُس رُخِ خنداں کو
اک تارِ شعاعی سے اُلجھا ہے جو پروانہ

مانا کہ بہت کچھ ہے یہ گرمیٔ حُسنِ شمع
اس سے بھی زیادہ ہے سوزِ غمِ پروانہ

زاہد کو تعجّب ہے صوفی کو تحیّر ہے
صد رشکِ طریقت ہے یہ لغزشِ مستانہ

اک قطرۂ شبنم پر خورشید ہے عکس آرا
یہ نیستی و ہستی افسانہ ہے افسانہ

انداز ہیں جذب اس میں سب شمعِ شبستاں کے
اک حُسن کی دُنیا ہے خاکستر پروانہ

گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر واپس چلے جاتے وہ بھی اس طرح جیسے رخصت نہیں ہو رہے بلکہ یونہی باہر جا رہے ہیں۔ جب میں صحت یاب ہو کر واپس آگیا تو ایک عرصہ کے بعد معلوم نہیں کس سلسلے میں میں نے پوچھا۔ کیوں اصغر صاحب آپ ہسپتال میں مجھے دیکھنے آتے تو آپ پر ایک طرح کی شگفتگی کیوں طاری رہتی۔ میں نے آپ کو اتفاقاً کبھی فکر مند نہ پایا کیا میری ہمت افزائی مقصود تھی؟ بولے بالکل نہیں اچھا سنئے ایک لطیفہ سناتا ہوں۔

ایک دن میں اکیڈمی سے مکان واپس آ رہا تھا ... صاحب راستہ میں ملے اور نہایت تشویشناک لہجے میں بولے اصغر صاحب بڑے افسوس کی بات ہے رشید صاحب کا

انتقال ہوگیا - ایسے تھے ویسے تھے - میں سُنکر ہنس پڑا اور بولا حضرت حواس کی باتیں کیجئے انتقال کرنا کیسا میں جانتا ہوں وہ زندہ ہیں اور تندرست ہوکر رہیں گے اُنہوں نے مجھے بدحواس یا بے وقوف سمجھا اور لگے اپنی خبر کے موثق ذرائع بتانے اور گنانے - میں نے کہا کہ یہ سب صحیح لیکن میں ہر ہفتہ دیکھ آتا ہوں - ان کی پیشانی پر نہایت جلی نقوش میں "حیات" لکھی ہوئی ہے - وہ نہ مانے - میں نے کہا آپ نہیں مانتے تو آئیے تار دے کر دریافت کریں - چنانچہ ایسا ہی کیا گیا - اور خبر غلط نکلی - رشید صاحب واقعہ یہ ہے کہ جب لکھنؤ پہنچ کر آپ کو دیکھتا تو فوراً یہ نظر آتا کہ زندگی اپنی پوری تابش و تازگی کے ساتھ موجود ہے اور میں مسرور و مطمئن ہوجاتا۔

دس بارہ سال تک اصغر صاحب کا ساتھ رہا - انہیں میں نے ہر حال میں دیکھا اور ہمیشہ اصغر صاحب ہی پایا یہ محض اتفاق تھا کہ وہ شاعر بھی تھے شاعر نہ ہوتے جب بھی ان کے شرف یا شہرت میں فرق نہ آتا - وہ جس موقع یا ماحول میں ہوتے - ممتاز و محبوب رہتے - وہ کچھ عالم متبحر نہ تھے - لیکن اردو کے بہت سے شعرا سے کہیں زیادہ ذی استعداد و ذی علم تھے - بڑی رسا طبیعت تھی - نئے سے نئے اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مسائل کی تہ تک

اس سہولت اور صفائی سے پہنچ جاتے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ اس مرحلہ سے انگاریہ سابقہ پہلے ہی بار پڑا تھا۔ انگریزی کی خواندگی کچھ زیادہ نہ تھی اور نہ فنِ تنقید کے جدید ترین اصول سے نا آشنا تھے۔ لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے مُشیرِ ادبی کی حیثیت سے اُن امور سے سابقہ پڑا تو آپ کے قلم سے نہایت متوازن۔ مستند دبے لوث تنقیدیں نکلیں۔ اور ترجمہ تو ایسا کرتے کہ اکثر اصل کا دھوکا ہوتا۔ سچے مسلمان اور مشرقی تھی لیکن ہم نے بڑے بڑے مغربیت مآبوں کو اصغر صاحب کی بصیرت اور ہمہ جہت شخصیت کا معترف پایا۔ اُردو میں عام نثر نگاروں کے برخلاف وہ اپنی تحریر میں زور رنگینی اور وزن پیدا کرنے کے لئے حشو و زوائد سے کام نہیں لیتے تھے۔ اُردو کے اکثر مستند اہل قلم بھی الف لیلہ کے یکبارہ سے ملتے جلتے ہیں۔ بات اتنی معمولی ہوگی کہ اُسے نہ بھی کہیں تو ہرج نہیں لکھیں گے۔ اس طرح جیسے دواؤں کا اشتہار لکھ رہے ہیں۔ ہندو مارے ڈالتا ہے۔ یا محبوبہ بھاگ گئی ہے۔ مرحوم تحریر و تقریر دونوں میں حفظ مراتب ملحوظ رکھتے تھے۔ انڈین پریس الہ آباد کی فرمائش پر اُنہوں نے "نمونوں" کا ایک سلسلہ بچوں کے لئے تصنیف کیا۔ جس میں مختلف ممالک کے حالات سے بچوں کو بڑے دلنشیں انداز سے روشناس کرایا

ہے۔ کچھ دنوں لاہور کے ادبی مرکز میں بھی علمی خدمات انجام دیں۔ منتخبات کے بعض سلسلے اصغر صاحب ہی کے مرتب کئے ہوئے ہیں اور بڑے مستند اور وقیع سمجھے جاتے ہیں۔

مرحوم نے ایک مستقل تصنیف "اردو کی ذہنی تاریخ" شروع کی تھی۔ کئی سو صفحات کا مسودہ اب تک ان کے کاغذات میں موجود ہے۔ لیکن اوراق اتنے بوسیدہ اور گڈ مڈ ہوگئے ہیں کہ ان کا مرتب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

اصغر صاحب کی آمدنی بہت کم تھی۔ لیکن میں نے ان کو کبھی تنگدستی کا شاکی نہ پایا۔ بڑا خرچ تھا۔ بہت اچھا پہنتے تھے۔ اس سے اچھا کھاتے تھے اپنی حیثیت سے زیادہ مدارات کرلیتے تھے۔ اُن سے دس گنی آمدنی والوں کو بھی میں نے اُن جیسا رکھ رکھاؤ رکھنے والا نہیں پایا۔ اُن کے جسم پر یا گھر میں کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی گئی جس سے شبہ بھی ہوسکتا کہ محض شوق پورا کرنے کی خاطر دوسرے یا تیسرے درجے کے بدل پر اکتفا کیا ہے ان کی ہر چیز میں ذوق و سلیقہ کی شہادت ملتی تھی۔ آج تک میلے اور پیوند لگے لباس میں نہیں دیکھے گئے۔ گفتگو میں رکیک یا سخیف فقرے زبان سے نہ نکالتے۔ گفتگو آہستہ کرتے۔ مسکرا کر کرتے لہجہ نہایت نرم

پُر وقار یا شگفتہ ہوتا۔ میں نے ان کو کبھی مایوس مضمحل یا مضطرب نہ پایا ان کے ملنے والے مختلف یا متضاد مشرب کے لوگ بھی تھے۔ لیکن وہ گفتگو اس انداز سے کرتے کہ اپنی وضع بھی ہاتھ سے نہ جاتی اور دوسرا بھی مایوس یا منغض نہ ہوتا۔

الہ آباد میں پہلے پہل انہوں نے کٹرہ میں ایک مکان دوکانوں کے ذیل میں لب سڑک لے لیا تھا۔ بیٹھک میں براق چاندنی کا فرش۔ تین چار گاؤ تکیے۔ الماریوں پر روغن دیوار پر قلعی۔ میں ملنے گیا تو پوچھا کیوں مکان ملنے میں تو دشواری نہیں ہوئی؟ میں نے کہا جی نہیں۔ البتہ ذرا شبہ ضرور ہوا کہ آپ کا مکان ہے یا حکیم اجمل خاں کا مطب۔ خدا کے لئے اس جگہ کو چھوڑ دیجئے لوگ بیٹھے ہوں تو شبہ ہو کہ یا تو مخصوص امراض کے مریض جمع ہیں یا آپ خاص قسم کے پیر ہیں۔ گھوڑے پر چوکا لگانے سے فائدہ؟ مجھے تعجب ہے آس پاس کے دوکانداروں نے آپ پر اب تک جلد کیوں نہیں کس دیا۔ اگر جلد چھوڑنا ممکن نہ ہو تو ہومیوپیتھک دواؤں کا کاروبار کیوں نہ شروع کر دیجئے۔ اصغر صاحب ہنس پڑے۔ فرمایا آپ نے بات ٹھیک کہی۔ مجھے صفائی بہت پسند ہے لیکن معلوم نہیں کیوں جب میں باہر سے آتا تھا تو بیک نظر مجھے یہ صفائی خود کھٹکتی تھی۔

بازار میں کوئی چیز نئی آتی تو اُسے فوراً خرید لے۔ دوستوں کو دکھائی جاتی۔ کوئی پسند کرلیتا تو اُسی کی نذر کر دیتے۔ ایک دفعہ مراد آباد سے نہایت باریک اور حسین نقشے کی سینی لائے۔ راستہ میں میرے ہاں ٹھہر گئے سینی دکھائی۔ پوچھا کہئے کیسی ہے۔ میں نے کہا عشرہ ہے عشرہ "فتوحات" میں سے ہے یا خریدی ہے؟ بولے جی نہیں۔ فتوحات کا یہاں کہاں گذر۔ میں نہ مُلّا نہ انگریز۔ خوشی تو خریدنے کی ہوتی ہے۔ میں نے پُوچھا کیا قیمت دی کہنے لگے واہ پسند کی بھی کوئی قیمت ہوتی ہے۔ سُنا نہیں۔

"جو کچھ کہا کہ تیرا حُسن ہوگیا محدود!"

بس یہ آپ کی نذر ہے وہ سینی اب تک میرے پاس ہے۔ بچوں کے گھر میں اس کی صورت مسخ ہوگئی ہے۔ اب جب کبھی مجھے نظر آجاتی ہے تو اُسے منجھواتا ہوں۔ اُسی میں کھانا منگواکر کھاتا ہوں۔ رنگ آمیزیاں غائب ہوچکی ہیں۔ نقوش دُھندلے ہوگئے ہیں۔ میں حافظ کا کچّا ہوں لیکن تاثرات دیر تک قائم رہتے ہیں۔ ان مٹتے ہوئے نقوش میں اصغر صاحب کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور جانے والے جانے" ہیں۔ بچھڑے ہوئے دوست کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ تو ماضی کے سیمیائی پردوں پر رنگ و آہنگ خط و خال۔ رعنائی

وزیبائی کے کیسے کیسے حزیں وحسین نقشے بن بن کر مٹتے ہیں اور مٹ مٹ کر بنتے ہیں! اصغر صاحب کھانے پلانے کے بڑے شوقین تھے۔ میں آنے والا ہوتا تو عجیب عجیب اہتمام کرتے۔ مرحوم کا انتقال فالج میں ہوا پہلا حملہ سہنے کو سہہ گئے مگر ہاتھ پاؤں کمزور ہو گئے تھے۔ پاؤں مشکل سے ہموار پڑتے۔ آخر آخر میں الہ آباد کے سینٹ ہال کے سامنے بلو بڈیر کے احاطہ میں ایک مکان کرایہ پر لے لیا تھا۔ مکان سے احاطے کے پھاٹک تک ایک طویل راستہ تقریباً پون فرلانگ لمبا چلا گیا تھا۔ میرا الہ آباد میں پہنچنے کا وقت متعین تھا میں نے ہمیشہ انتظار میں انہیں اس طویل سڑک پر ٹہلتے ہوئے پایا۔ اس میں کچھ فرق نہ آیا۔ پہلے چست آڑا پاجامہ پہنتے تھے۔ بیماری کے بعد سے غرارہ دار پہننے لگے تھے۔ لمبا پھنسی آستینوں کا کرتا۔ سر پر سفید ٹوپی۔ ایک ہاتھ میں پانوں کی ڈبیہ بٹوہ۔ دوسرے میں مختلف اقسام کے سگار۔ سگرٹوں کے ڈبے۔ آہستہ آہستہ سر جھکائے قدم سنبھالتے ٹہلتے ہوتے۔ مجھے آتا دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے۔ ہائے اُن کا باغ باغ ہونا۔ زبان سے مرحبا مبارک سلامت کچھ نہ کہتے۔ البتہ آنکھوں میں خوشی کی چمک ایسی ہوتی کہ مجھے اپنے قلب میں اُترتی معلوم ہوتی۔ لبوں پر مسکراہٹ اور باتوں میں شادمانی کی وہ گھلاوٹ

کہ بیان سے باہر ہے۔ خوشی کا اظہار اپنے کسی ارادے یا اشارے تک سے نہ ہونے دیتے۔ لیکن سر سے پاؤں تک شگفتہ و زمزمہ سنج معلوم ہوتے۔

ان کی باتیں تھوڑی بہت اب تک یاد ہیں۔ کہنے رشید صاحب سُنا جب سے بیمار ہوا ہوں ذرا زیادہ عیاش ہوگیا ہوں۔ ہر طرح کے پان تمباکو فراہم رکھتا ہوں۔ یہ دیکھئے ہر مارکہ کا سگرٹ ہے ہر ایک کا رنگ جُدا ہے۔ اُن میں وہی لُطف آتا ہے جو مخصوص اصحاب کی صحبتوں میں آتا ہے۔ اسی قسم کی باتیں کرتے کرتے مکان پہنچے۔ نوکر کو آواز دیتے ناشتہ لاؤ۔ فرماتے یہ لیجئے میں نے ہارلکس مالٹڈ مِلک شروع کردیا ہے۔ یہ اوولٹین کا گلاس ہے۔ یہ فروٹ ہے اور ہاں آپ نے کونسٹر کے مکھن کھائے ہیں۔ ذرا یہ پُڈن بھی ملاحظہ فرمائیے۔ غرضکہ ہر چیز بڑے شوق و لُطف سے پیش کرتے پھر کہتے ناشتہ کر لیجئے۔ وہ بھی حاضر کیا جائیگا۔ مدتوں سے بانگ احتجاج دے رہا تھا۔ میں نے کہہ دیا تھا دن قریب ہیں۔ آج اُسے آپ دسترخوان پر چاروں شانے چت پائیں گے۔ یہ مُرغ مسلّم کا عنوان تھا۔

اور ہاں یہ پان لکھنؤ کا ہے۔ آپ علی گڑھ کے پانوں کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں۔ آج لکھنؤ اور بنارس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ برقی قوام ہے وہ زعفرانی

بنی ہے اور ہاں (نوکر کو آواز دیکر) ذرا وہ گولیاں تو لانا حکیم ..... صاحب نے دی ہیں کہنے لگے اُن کے مورث اعلیٰ نے شاہانِ اودھ کے لئے بڑے اہتمام سے اس کا نسخہ تیار کرایا تھا۔ اس کا نام "آبروئے اودھ" ہے اسے ضرور چکھئے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے لیکن اس سے علی گڑھ کی آبرو پر کیا اثر پڑیگا۔ کہنے لگے لیتے جایئے۔ جس کی آبرو خطرے میں دیکھئے گا دیدیجئے گا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن میں خوب سمجھتا تھا کہ یہ سارا اہتمام اور لطف بیان میرے لئے تھا۔ جو چیزیں اور جو باتیں مجھے پسند تھیں۔ انہیں کو المضاعف کرکے اور خود اودھ کر پیش کررہے تھے۔ اور اس لطف و نزاکت سے کہ مجھے اُن کی اس حکمت عملی کو فاش کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ امرودوں کی فصل ہوتی تو اُس کا ایک ٹوکرا ساتھ کردیتے اور دینے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب کو بھیجنے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ آجکل موجود نہیں ہیں زیادہ تو میں نے رکھ لئے کچھ آپ لیتے جایئے۔ کبھی کہتے فلاں صاحب نے علی گڑھ میں فرمائش کی تھی۔ تھوڑے اُنہیں بھی کچھ بھیجئے گا۔

ایک بار متعلقین وطن سے واپس علی گڑھ آرہے تھے۔ راستہ میں چند گھنٹوں کے لئے الہ آباد میں اصغر صاحب

کے ہاں ٹھہر گئے۔ میرا سب سے چھوٹا بچہ احمد گود میں تھا۔ مرحوم کو بچے کی شکل اور وضع قطع ایسی پسند آئی کہ ٹھیک دوپہر میں اسے گود میں لئے سنبھلتے لڑکھڑاتے پیدل اپنے ایک عزیز دوست کے ہاں پہنچے۔ اصغر صاحب کو اس طرح آتے دیکھ کر اُن کے دوست اور گھر والوں کو بہت تعجب ہوا۔ سب کے سب دوڑ پڑے۔ کیونکہ اصغر صاحب کو ڈاکٹر نے چارپائی پر مسلسل لیٹے رہنے کی تاکید کی تھی۔ غذا بھی کم کردی تھی۔ ہفتوں بعد چارپائی سے اٹھے تھے۔ اس لئے بہت نحیف ہوگئے تھے۔ بہترا لوگوں نے سمجھایا اور نوکر نے مانگا۔ لیکن احمد کو اپنی گود سے نہ اُتارا۔ تھوڑی دیر بعد بچے کو گود ہی میں لئے واپس ہوئے۔ شام تک اس کے ساتھ طرح طرح سے کھیلتے رہے۔ حتیٰ کہ دودھ پینے کے لئے ماں تک جانے نہ دیا۔

کچھ دنوں کے بعد ملاقات ہوئی تو میں نے پُوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا تھا۔ بولے رشید صاحب آپ تو دیکھتے ہو (دوست کا بچہ) کتنا خوبصورت۔ معصوم اور پیارا بچہ ہے۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بچّوں سے مجھے کتنی اُلفت ہے اور اُس کے والدین میرے کتنے سچے اور گہرے دوست ہیں۔ اس دن آپ کے متعلقین آئے تو میں نے احمد کو دیکھا۔ آپ اندازہ نہیں کرسکتے

اسے دیکھ کر میرے دل پر کیا اثر ہوا - اوّل تو میں بھول گیا کہ بیمار و نحیف ہوں - دوسرے دل میں ایک عجیب فخر آمیز پندار پیدا ہوا کہ احمد بتّو سے کہیں زیادہ دلکش اور پیارا ہے - ذرا میری بدحواسی تو دیکھئے میں نے بتّو کے والدین سے بھی کہہ دیا کہ احمد نے بتّو کو زیر کردیا - چنانچہ جس فاتحانہ انداز کے ساتھ میں گیا - اُس سے کہیں زیادہ فاتحانہ فخر و مباہات سے واپس آیا - احمد نے میری ایک کمی پوری کردی -

ایک بار خط آیا لکھا تھا " ہاؤ پریشر اور احمد کی محبت دونوں بڑھ رہی ہیں دیکھئے کیا انجام ہو "

مجھے اچھے گلابوں کا بڑا شوق ہے - مرحوم اسے جانتے تھے - جب کبھی الہ آباد جاتا تو وہ پتہ لگاتے ہوتے کہ کہاں کہاں اچھے گلاب ہیں - اجنبی ہوتا تو اس سے رسم و راہ پیدا کرلیتا - مجھے لے جاتے اور گلاب پسند کراتے - ایک بار ایسے ہی مجھے ایک جگہ لے گئے - مالک سے زیادہ خود تعریف کرتے گلاب یوں ہی سے تھے اور میں نے ایک آدھ کی اخلاقاً ٹوٹی پھوٹی تعریف بھی کردی - معاً اصغر صاحب نے اُسے حاصل کرنے کے لئے ڈورے ڈالنے شروع کردیئے میں نے موقع نکال کر چپکے سے کہہ دیا - اصغر صاحب فکر نہ کیجئے - سب کے سب معمولی درجے کے ہیں - مرحوم

کو غیر معمولی مایوسی ہوئی۔ واپسی میں میں نے پوچھا کہ یہ آپ چُپ کیسے ہوگئے؟ کہنے لگے کیا کہوں۔ ان گلابوں کے نادر ہونے اور اس شخص کے نامعقول ہونے کا بڑا شہرہ سُنا تھا۔ گلابوں کے بارے میں تو آپ نے فیصلہ کردیا۔ نامعقول ہونے کا حال مجھ سے پوچھئے۔ کمبخت کسی طرح رام ہی نہ ہوتا...... صاحب (الہ آباد کے سب سے مقتدر آدمی) کی معرفت اُسے قابو میں کیا گیا۔ اس کے ساتھ میں نے وقتاً فوقتاً جتنا اخلاق برتا ہے الہ آباد کا کوئی معقول و شریف آدمی برتنا گوارا نہ کریگا۔ ٹھیک ہے ایسے مہمل آدمی کے گلاب کیونکر عمدہ ہوسکتے ہیں! پھر خود ہی ہنس پڑے۔

مجھ میں ایک بدعادت یہ ہے کہ کہیں جاؤں علی گڑھ سے آخری گاڑی سے روانہ ہوں گا اور کام ختم ہوجانے پر پہلی گاڑی سے واپس آجاؤں گا۔ مرحوم کی آخری علالت کے زمانہ میں میرا جانا الہ آباد ہوا۔ صبح پہنچا شام کی گاڑی سے واپس ہونا چاہا۔ مرحوم چاہتے تھے کہ میں رات میں وہیں قیام کروں۔ ہزار ہزار طریقہ سے وقت ٹال دینے کی کوشش کرتے رہے۔ جب دیکھا کہ کام نہیں چلتا تو اصرار کرنے لگے کہ تعطیل کا زمانہ ہے کوئی ہرج نہ ہوگا۔ صبح چلے جائیے گا۔ میں ایسا بدبخت کہ

نہ مانا اور شام ہی کی گاڑی سے واپس چلا آیا۔
مجھے کیا خبر کہ یہ آخری ملاقات اور پہلا اور آخری ہی اصرار تھا۔ میرے انکار پر ایسا معلوم ہوا جیسے مرحوم کے چہرے پر زخ پڑ گئی۔ لیکن میں کیا بتاؤں کس ضبط و پامردی اور کس مرحمت سے فرمایا تو پھر آپکی خوشی۔ وہ سماں اب بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے تو مجھے اپنی اوقات سے نفرت ہوجاتی ہے۔ اور اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں اس واقعہ کا تذکرہ نہ کرتا لیکن مرحوم کو میں نے جس طور پر اور جس حالت میں شکستہ خاطر کیا تھا اس کی پاداش میں اپنی اس شقاوت کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں۔ اس اعلان و اعتراف سے کبھی کبھی اُمید بندھتی ہے کہ شاید اپنے نفس کی ملامت اور دوسروں کی لعنت کا ہدف بن کر کبھی اور کہیں اصغر صاحب مرحوم کی رُوح کا سامنا کرنے کی ہمّت ہو سکے۔

دو ہی ایک روز کے اندر اندر تار آیا کہ اصغر صاحب نے رحلت فرمائی۔

دوسرے دن میں الہ آباد پہنچا۔ بلویڈیر کا راستہ سونا تھا۔ طبیعت بے اختیار ہو گئی۔ خلوص و محبت و مرحمت کا وہ پیکر مجسّم ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو چکا تھا۔ ایسا

معلوم ہوا جیسے زندگی کی بڑی مضبوط طناب ٹوٹ گئی۔ زندگی جو عبارت تھی دوست کی محبت و شیفتگی سے اسمیں ایک خلا پیدا ہوگیا۔ ایسا خلا جس میں بیابانی برفستانی ہواؤں اور گورستانی سناٹوں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ اب ہمہ تن شوق ہوکر میرا کون انتظار کریگا۔ میری تحریروں پر کس کو وجد آئیگا اور کون اسے مسرت و فخر سے لوگوں کو دکھاتا سُناتا پھریگا۔ میرا کوئی مضمون شائع ہوتا سب سے پہلے اصغر صاحب کا ستائشی خط آتا۔ اصغر صاحب کی رحلت نے مضمون لکھنے کا ولولہ بڑی حد تک سرد کردیا۔ میرے اچھے یا بُرے خیالات کا بیشتر حصہ مضمون لکھنے کے دوران میں مجھے شان و گمان معلوم نہیں کیوں اور کس طرح آتا ہے۔ جب کوئی اچھا خیال یا فقرہ ذہن میں آتا تو اس کی خوشی ہوتی کہ اصغر صاحب اس کی داد دیں گے۔ اور لکھو۔ بہتر لکھو اور جلد لکھو کی اُمنگ پیدا ہوتی۔ اب وہ بات نہیں بعض باتیں کہیں نہ کہیں اور کسی طور پر قلم سے ایسی بھی نکل جاتی ہیں جن کے بارے میں مجھے خود اندیشہ رہتا ہے کہ شائد اس کی تہہ تک لوگ نہ پہنچیں یا پہنچنا گوارا نہ کریں۔ اصغر صاحب ہمیشہ اسے پا جاتے اور داد دیتے اور ملاقات ہوتی تو سب سے پہلے اُسی پر گفتگو کرتے۔ اس واقعہ کے بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ میں کوئی بڑا

صاحب فکر ہوں یا لوگ میری بات نہیں سمجھتے تو کسی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہرگز نہیں شخصی تجربات یا تاثرات کے لئے غیر معمولی فراست یا علمیت لازمی نہیں ہے۔ یہ تو ہر شخص کے بھید ہوتے ہیں جن سے وہ خود ہی زیادہ واقف ہوتا ہے۔ میرا یہاں مطلب صرف اس شگفتگی سے ہے جو میرے باریک سے باریک اور نازک سے نازک تاثرات و تصوّرات سے مرحوم کو تھی اور جن کے خفیف سے خفیف ارتعاش بھی اُنکے ذہن و دماغ پر مرتسم ہوجاتے۔

فالج کے حملہ کے بعد سے ڈاکٹروں نے ان پر بہت سی پابندیاں عائد کردی تھیں۔ جن پر وہ محض اسوجہ سے عامل رہتے تھے کہ ڈاکٹر کا یہی حکم تھا۔ ورنہ وہ مرض کے انجام سے ڈرتے نہ تھے۔ غذا یا رہنے سہنے کے سلسلے میں جو پرہیز بتایا گیا تھا۔ اس میں عجیب لطافتیں پیدا کرلی تھیں۔ خون کا دباؤ بے حد تھا لیکن وہ قریب قریب بھلے چنگوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک بار ڈاکٹر نے کہا خون کے اس دباؤ کے ہوتے ہوئے آپ کا زندہ رہنا بھی کرامات میں سے ہے۔ اصغر صاحب نے کہا بہت ممکن ہے موت اسی سے واقع ہو۔ لیکن زندہ رہنے کے اور ہی گُر ہیں۔ زندہ رہنے میں ارادے کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ ہوش میں رہ کر تو میں مرونگا نہیں البتہ

بے خبری میں آپ کا بس چلے تو موت سے نپٹ لیجئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مرحوم رات کے کھانے پر دوستوں میں سے کسی کے ہاں مدعو تھے۔ سب لوگ ہنس بول رہے تھے کہ فالج کا شدید حملہ اور یک لخت حملہ ہوا۔ اور چند گھنٹے مطلق بے خبری کے عالم میں رہ کر ہمیشگی میں مل گئے۔

اصغر صاحب زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گذرے تھے۔ ہر قسم کی صحبتیں دیکھی تھیں لیکن انہوں نے خودداری اور بانکپن کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں ان کا شاعر ہونا اتفاقی تھا۔ وہ کچھ اور ہوتے تو بھی یہی رنگ قائم رہتا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے ان کے بہت سے ملنے والوں سے سابقہ ہوا۔ اوباش قلندر۔ ارباب علم و فکر۔ صاحب باطن۔ ارباب دول۔ بکواسی و بے بہرہ۔ طالب علم۔ کاروباری لوگ۔ میں نے ہر ایک کو ان کا قائل پایا۔ ان کے دشمن بھی کم نہ تھے جنہوں نے مخالفت میں وہ سب کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ لیکن اصغر صاحب کو گھٹیا کسی نے نہیں بتایا۔ اصغر صاحب کے جاننے پہچاننے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو بڑے بڑے مناصب پر فائز تھے۔ جنکی قابلیت و شخصیت مسلّم ہے۔ وہ بھی اصغر صاحب کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ مرحوم میں وہ بات نہ تھی جو ساحروں

یا فاتحوں میں ہوتی ہے - کہ ان کے سامنے رہیے تو سب کچھ - بعد میں کچھ نہیں - مرحوم تسخیر نہیں کرتے تھے - بلکہ لوگ خود ان کی اُلفت واخلاص کی منزلت کرنا عزیز رکھتے تھے -

ان میں خاص نوعیت کی بڑائی تھی - جس کا ہر بڑائی کو لحاظ رکھنا پڑتا تھا -

جامعہ ملیہ میں ایک بار مشاعرہ تھا - شعر خوانی وشعر سرائی ہو رہی تھی - اصغر صاحب کی باری آئی - مرحوم کی آواز طبعاً پست تھی - شعر پڑھنے شروع کئے تو مجمع میں انتشار پیدا ہوا - مرشد (ذاکر صاحب) پاس بیٹھے ہوئے تھے - یک بیک اصغر صاحب سے پرچہ لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور شعر سُنانے شروع کر دیئے - ایک شعر یاد رہ گیا ہے ؎

زلا تسخیر کردم ایں جہانے مہر و انجم را
زجوش بندگی پروردگار کردہ ام پیدا

میں جانتا ہوں - مرشد کا یہ اضطراری فعل کس راز کی غمازی کر رہا تھا - اور مرشد کے اضطراری فعل کا کیا درجہ ہوتا ہے - ان کے چند ہی اضطراری آنسوؤں نے علی گڈھ کی آبرو رکھ لی اور جامعہ کو جامعہ بنا دیا - اور مسلمانوں میں ایک نژاد نو کی طرح ڈالی -

اصغر صاحب مشاعروں سے بیزار تھے - لیکن کہا

کرتے تھے کہ طالب علموں کی دعوت رد کرنا گناہ ہے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ ان میں بے راہ روی ضرور پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن یہ قصور ہمارا ہے۔ ہم میں نظر و فکر کی وہ گہرائی اور وسعت باقی نہیں رہی جو سفینہ نو کی متحمل ہو سکے۔

جگر صاحب سے ان کے خاص تعلقات تھے۔ وہ ان کی بے راہ روی سے بڑے کُڑھتے تھے۔ لیکن ان سے محبت کرتے تھے۔ جگر صاحب انتہائی خود فراموشی کے عالم میں بھی اصغر صاحب کا بڑا پاس کرتے تھے۔ مرحوم اکثر جگر صاحب سے کہتے تھے کہ جو چاہو کر لو۔ آنا تم کو یہیں پڑیگا۔ جگر صاحب ایسے غیور عزت پسند۔ فانح اور ساده مزاج شاعر کم دیکھنے میں آئے۔ جن کو وہ اپنے نزدیک بزرگ یا بہتر سمجھتے ہیں۔ اس کا لحاظ اس طرح کرتے ہیں جیسے پُرانے زمانے میں چھوٹے اپنے بڑوں کا کرتے تھے۔ بایں ہمہ جگر صاحب ایسا منہ پھٹ آدمی بھی کم ملے گا۔ جاہ و شہرت سے مرعوب ہونا جانتے ہی نہیں۔ اپنی اس افتاد طبع سے بعض مواقع پر عجیب عجیب نزاکتیں پیدا کردیں۔ اب تو خدا کے فضل سے مدتوں سے عالم ہوش میں ہیں اور پچھلی عادت یک قلم ترک کردی ہے۔ ہم نے ان کو انتہائی ازخود رفتگی کے عالم میں دیکھا ہے اور بڑے سے بڑے شاعر اور شخصیت کو سخت سُست کہتے

سُنا۔ لیکن اصغر صاحب کا نام آتے ہی ان کو یا تو سناٹے میں آتے دیکھا یا بے اختیار اشکبار پایا اور جگر صاحب کا اب تو یہ عالم ہے کہ وہ اصغر صاحب کے مخصوص انداز و اطوار میں اپنے کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی بعض بعض باتوں کو اصغر صاحب کے باطنی تصرف کا صدقہ سمجھتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں۔

اصغر صاحب کے کلام پر ان کی زندگی ہی میں بعض ناقدین نے سخت نکتہ چینیاں کیں۔ مرحوم کی نظر سے یہ سارے مضامین گذرتے تھے لیکن ہم نے آجتک ان کی زبان سے ناقدوں کو بُرا بھلا کہتے نا سُنا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ ناقدوں کا درجہ بہت بلند ہے۔ بشرطیکہ وہ مخلص اور سمجھدار ہوں خدا کا مفسر شاعر ہے اور شاعر کا مفسر نقاد ہوتا ہے۔ یہ کڑیاں اُٹھ جائیں تو دنیا اختلالِ محض ہوکر رہ جائے۔ ایک دفعہ اُنہوں نے فرمایا تھا کہ لوگ اپنی افتادِ طبع کا احتساب کئے بغیر غزل یا غزل گو سے برہم ہونے لگتے ہیں۔ لوگ غزل سے بیزار ہیں اس لئے کہ اس کے موضوع کو پسند نہیں کرتے۔ حالانکہ۔ اب غزل کا موضوع ہی نہیں بلکہ اس کا رنگ اور آہنگ بھی بہت کچھ بدل گیا ہے۔ یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ بڑے غزلگویوں

نے کیا خرابیاں پھیلائیں۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ اچھے
غزل گو کتنی خوبیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ اور پھیلا سکتے ہیں۔
مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ میں غزل کو مدنظر رکھ کر شعر
نہیں کہتا۔ اس کو کیا کروں کہ بلند، گہرے، نازک اور لطیف
خیالات خود بخود غزل کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں
کاش میرے خیالات و احساسات کوئی دوسرا پیکر اختیار کر
لیتے۔ مجھے قطعاً افسوس نہ ہوگا اگر وہ غزل نہ کہلائیں۔
ایک دفعہ میں نے عرض کیا۔ اصغر صاحب آپ تو
جتنے اور جیسے شعر چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں
کرتے کہ غزل میں صرف اول درجے کے اشعار تو رہنے دیا
کیجئے۔ بقیہ کو حذف کر دیا کیجئے۔ اصغر صاحب پر ایک جھرجھری
سی طاری ہوئی۔ پہلو بدل کر بیٹھ گئے فرمایا۔ رشید صاحب یہ
آپ نے کیا بات کہی؟ آپ ایسی باتیں کرتے ہیں! شاعر
کبھی دوسرے درجے کی بات کہتا ہے؟ کہہ بھی سکتا ہے؟
وہ تو ہمیشہ اول ہی درجے کے شعر کہتا ہے۔ سننے والے سے
کے نزدیک وہ اوّل درجے کا ہو یا دوم درجے کا ہو۔ اس
شاعر کو کیا علاقہ! آپ کے نزدیک وہ چھوٹی ہو تو ہو۔ جب
شاعر نے اُسے کہہ دیا تو وہ بڑی ہوگئی۔ بہت بڑی۔
کچھ دن اور گذریں تو یہ حقیقت آپ پر خود واضح ہوجائیگی
اصغر صاحب کو سجاد انصاری مرحوم سے بڑا لگاؤ تھا۔
کہتے تھے زندگی نے وفا نہ کی ورنہ خدا جانے کیا ہوتے فرمایا

ہم ہیں ایسے نقاد اور مفکر کی بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ اُردو میں خرافات نگاروں کی تعداد بہت جلد بڑھ جاتی ہے جن کا ازالہ نہ کیا جائے تو ہونہاروں پر زندگی تنگ ہوجائے بڑے بت شکن تھے۔ کچھ دن اور جیتے ہوتے تو کیا معلوم توفیق الہٰی انہیں براہیم بنا دیتی۔

سر تیج بہادر سپرو کا بڑا احترام کرتے تھے۔ کہتے تھے سر سپرو کا احترام کرنے میں لطف آتا ہے اس لئے کہ وہ احترام کی حرمت سے واقف ہیں۔ باتوں باتوں میں ایک دن فرمانے لگے کہ ان کی صحبت میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی حال میں اپنی سطح سے اُتریں گے نہ حاضرین میں سے کسی کو اسکی حدود سے گذرنے دینگے اُردو ہندی کے سلسلے میں کہنے لگے کہ ہندوستان میں سر سپرو اور پنڈت کیفی ہی ایسے ہندو ہیں جن کو اُردو سے بر بنائے اُردو الفت ہے۔ دونوں میں پُرانے زمانہ کے مسلمان شرفا جیسی وضع داری ملتی ہے۔

اُونچی جماعتوں کے مختلف الخیال طلبا، اکثر ان کی صحبت میں دیکھے گئے تعجب ہوتا کہ یہ نوجوان جدید ترین افکار کے حامل ہوتے ہوئے بھی کس طرح اصغر صاحب کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ میں نے مرحوم سے ایکبار دفعہ اس کی وجہ پوچھی بولے دنیا میں ایک ہی مستقل علم تو ہے نہیں۔ ہر علم کے تار و پود ایکدوسرے سے ملے ہوئے ہیں ایک ہی علم کی تکمیل مختلف علوم یعنی مختلف معلّموں سے ہوتی ہے۔

پھر آپ تو جانتے ہیں کتابی اور اخباری علم اسکراکس بزرگوں کے "تصرف" کا ہمیشہ محتاج رہیگا۔ جب علم ارزاں اور معلّم نایاب ہوں تو ظاہر ہے ہم آپ نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

اصغر صاحب مرحوم کے کلام پر گفتگو کرنے کا یہ محل نہیں۔ لیکن میری مشکل یہ ہے کہ ان کے کلام کو انکی زندگی سے علیحدہ بھی نہیں کر سکتا۔ مرحوم کا ذکر چھیڑتا ہوں تو بار بار انکا کلام سامنے آتا ہے۔ اور ان کے کلام کی طرف رجوع ہوتا ہوں تو اصغر صاحب جیتے جاگتے مسکراتے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔ ان کے کلام کو جسم و جان میں منتقل کیجئے تو اصغر صاحب اور اصغر صاحب کو الفاظ و عبارت میں تحریر کیجئے تو ان کا کلام۔

کلام سامنے آجانے سے مقصد ان کے اشعار کا یاد آجانا نہیں ہے۔ بلکہ وہ جمال و کمال اور تصورات کی وہ مینا کاری و فردوس آرائی ہے جسے ان کا کلام بروئے کار لاتا ہے۔ ان کا کلام انہیں کی طرح محبت کرنے والا رفاقت کرنے والا اور ترفع پیدا کرنے والا ہے۔ اصغر آپ کو فکر کی زحمت نہیں دیتے۔ یہ زحمت وہ خود اٹھاتے ہیں وہ اپنے فکر کے رنگین و رعنا نقوش سے آپکی مدارات کرتے ہیں اور مدارات بھی اس طرح کرتے ہیں کہ آپ پر

کسی قسم کا بار نہیں ہوتا۔ یہی بات اصغر صاحب کی زندگی میں ملتی تھی۔

اس سلسلے میں محض افہام تفہیم کی خاطر میں ضمناً اقبال کا بھی ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔ اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے حاتم طائی کے کوہ ندا کی مانند وہ اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے۔ اور آپ سے کچھ بن نہ پڑیگا۔ اصغر سے رجوع کیجئے۔ وہ آپ کے ساتھ ہو لیں گے۔ اقبال آپ کو سر مو اِدھر اُدھر نہ ہونے دیں گے۔ اصغر سے آپ خود علیحدہ نہ ہونا چاہیں گے۔ اقبال کے ہاں موضوع فکر (تفہیم) اور دعوتِ عمل ہے۔ اصغر کے ہاں تصوّرات رنگین اور دعوت دید ہے۔ اقبال حکومت کرتے ہیں اور اصغر رفاقت کرتے ہیں۔ معنوی حیثیت سے دونوں جدا ہیں اور اپنی اپنی وادی کے امام ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور ان کے دروبست کے اہتمام (ترصیع) میں دونوں انتہائی احتیاط اور صناعت کاری کو دخل دیتے ہیں۔ اور سلیقہ اور شرافت کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔

اصغر کی زندگی ہی سلیقہ شرافت اور صداقت میں گذری ظاہر ہے۔ یہی رنگ اُن کے کلام کا بھی ہوگا۔ اصغر سرتا سر غزل گو ہیں لیکن ان کے کلام میں غزل کی مروجہ یا مسلّمہ عریانی یا خامکاری نہ ملے گی۔ آپ انکا کلام بے تکلف جسکے سامنے چاہے پڑھ سکتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے الفاظ اور جذبات کو پورے

طور پر ملحوظ رکھا ہے اور دونوں کو انتہائی احتیاط اور سلیقہ سے اپنے کلام میں برتا ہے ۔ ان کے ہاں ترغیبات یا تجربات جنسی نہ ملیں گے بلکہ انکی لطافتیں اور نزاکتیں ان کی رفعتیں اور انکی دلداریاں ۔ ان کے ہاں تفصیل نہیں تحلیل ہے ۔ کیمیائی یا نفسیاتی تحلیل نہیں بلکہ شاعرانہ و عارفانہ تحلیل پھر وہ اس تحلیل کو الفاظ ومعنی کیف وکم رنگ و آہنگ کے ایسے فانوس میں گردش دیتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے اپنے محبوب کا خد و خال نظر آتا ہے ۔ عارفانہ بصیرت اور شاعرانہ صناعت کاری کا معجزہ بھی یہی ہے

اصغر عوام کے شاعر نہیں ہیں ۔ ان کے کلام کے حُسن تاثیر سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ تھوڑے بہت لکھے پڑھے بھلے مانسوں میں بیٹھے اور ذوق و بصیرت رکھتے ہوں ۔ شاعری نہیں دُنیا کا ہر شریف فن ریاض اور رکھ رکھاؤ چاہتا ہے ۔ اصغر صاحب کی شاعری اسی کا نمونہ ہے ۔ اگر جدید اسکول اسے پسند نہیں کرتا تو یہ اصغر صاحب کا قصور نہیں ہے ۔ قصور اس مقصد اور معیار کا ہے ۔ جس کے واضع نہ مقلد نہ مداح !

اصغر صاحب اپنے کلام کی جنت میں ہمیشہ زندہ قائم رہیں گے ۔

اشارات و فرہنگ

صفحہ ۱ - یہ قصہ "فسانۂ عجائب" مصنفہ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی سے لیا گیا ہے۔ یہ فسانہ ۱۸۲۵ء میں تصنیف ہوا۔
میر امن دہلوی نے "باغ و بہار" یعنی قصہ چہار درویش ۱۸۰۳ء میں فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب میں جو زبان اور طرزِ بیان اختیار کیا گیا ہے اس کی خصوصیات ہیں روانی، سلاست، محاورہ کی خوبی روزمرہ کی صفائی اور بے تکلفی — یہ طرزِ تحریر سرور کو ناپسند تھا۔ لہذا انہوں نے "باغ و بہار" کے جواب میں "فسانۂ عجائب" تصنیف کیا۔ جس کی عبارت مقفٰی و مسجع اور طرزِ ادا میں رنگینی اور تصنع ہے۔

۳ - یمن - جزیرۂ عرب کے جنوب مغربی گوشے میں ایک ملک ہے۔
گوشِ حق نیوش - سچی بات کو سننے والا کان۔

۴ - لِلّٰہ - خدا کے واسطے۔
مگر شاہی بہر کیف موجود ہے - شاہی یعنی فقیری، درویشی۔
قُل سیرو فی الارض - کہہ دو کہ (اے لوگو!) زمین کی دمانک کی سیر و سیاحت کرو۔

۵ - دُنیا کا زُور نقشہ ہے - زور - مکر و فریب -
کہ ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است - یہ بوڑھی عورت

صفحہ - ہزاروں شوہروں کی دلہن ہے - یعنی دُنیا بڑی بے وفا ہے -
سعدی - شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی (۱۱۸۴ء - ۱۲۹۲ء)
فارسی کے مشہور شاعر اور "گلستان"، "بوستان" کے مصنف -
حاجت مشاطہ نیست روے دلآرام را - (سعدی) محبوب کے
چہرے کی آرائش کے لئے کسی نائن یعنی اس عورت کی جو دلہنوں کی کنگھی
چوٹی کرتی ہے - کوئی ضرورت نہیں -
۷ - مصحفی - شیخ غلام ہمدانی مصحفی دہلوی (۱۷۵۰ء - ۱۸۲۴ء)
اُردو کے مشہور شاعر -
۸ - عازم اقلیم عدم ہونا - مرجانا -
عنقا - ایک عجیب الخلقت پرندہ جو اب معدوم ہوچکا ہے - سترور
کے نزدیک عنقا اور ہما ایک ہی پرندے کے نام ہیں - ہما کے
بارے میں خیال ہے کہ اگر یہ پرندہ کسی شخص کے سر پر سایہ
ڈال دے تو وہ بادشاہ ہوجاتا ہے -
۹ - ہما - دیکھو صفحہ ۸ - عنقا -
توپخانہ میں شلک ہوئی - یعنی توپیں چلائی گئیں - خوشی کے موقعوں پر
بندوقیں اور توپیں چلائی جاتی ہیں -
گز سکے پر نام جاری ہوا - بادشاہ وقت کا نام گز اور سکے پر کندہ
ہوتا ہے -
سوز - سید محمد میر سوز (۱۷۲۰ء - ۱۷۹۸ء) اُردو کے شاعر -
مرزا رفیع - مرزا محمد رفیع سودا (۱۷۱۳ء - ۱۷۸۱ء)
اُردو کے مشہور شاعر)

صفحہ ۔ عُجب (عُجب) تکبر، غرور۔
بالِ ہما ۔ دیکھو صفحہ ۸ (عنقا)
ظلِ سبحانی ۔ اللہ تعالےٰ کا سایہ۔ بادشاہ کو کہتے ہیں اس لئے
کہ وہ لوگوں میں امن وامان قائم رکھتا ہے۔
۱۰ ۔ جلّ جلالہٗ ۔ اللہ کی شان بڑی بزرگ ہے۔ تعجب وحیرت کے
موقع پر بولتے ہیں۔
سنگ تفرقہ ۔ جدائی پیدا کردینے والا پتھر۔
حکم حاکم مرگ مفاجات ۔ حاکم کے حکم کے روبرو سرِ تسلیم خم کرنا
ہی پڑتا ہے۔
جامع المتفرقین ۔ بچھڑوں کو ملادینے والا۔ یعنی خُدا۔
۱۱ ۔ علی الدوام ۔ ہمیشہ۔
کُل امر مرھونِ باوقاتہا ۔ ہر کام کے لئے وقت مقرر ہے۔
خانہ زاد ۔ وہ غلام جو خریدا نہ گیا ہو بلکہ گھر کی لونڈی ہی کے
بطن سے ہو۔
۱۳ ۔ بادشاہ پاس ۔ بادشاہ کے پاس اب "کے" کا ترک
متروک ہے۔
جب جلاد سپہر ۔ . . . . . عالم ہوا ۔ یعنی صبح ہوئی۔
کاروان عدم . . . . . سبکدوش کیا ۔ یعنی قتل کردیا۔
۱۴ ۔ تلخ کامی ۔ ناکوئی کردہ ہونا ۔ یعنی ناکامی۔ نامرادی۔
۱۷ ۔ آزاد ۔ "فسانۂ آزاد" کا ہیرو۔
قبالہ لکھواسے تو آئے تھے نہیں ۔ قبالہ۔ سند مکان کی

صفحہ - مطلب یہ ہے کہ آزاد کا ارادہ یہ نہیں تھا کہ وہاں مکان خرید کر
مستقل قیام کیا جائے -

۱۸ - کٹورہ الگ کھنک رہا ہے - میاں بہشتی جو سبیلوں ٹھیاؤں یا بازاروں
میں لوگوں کو پانی پلاتے پھرا کرتے ہیں
ان کے ہاتھ میں دو کٹورے ہوتے ہیں
جن کو وہ برابر بجاتے رہتے ہیں تاکہ لوگ ان کے
مفید وجود سے باخبر رہیں -

ساقی - پانی یا شراب لیکن عموماً شراب پلانے والا - یہاں حقہ
پلانے والے سے مراد ہے -

دو سیرا خمیرہ - خوشبودار اور قیمتی تمباکو کشیدنی -

طبلۂ عطار - عطر بیچنے والے (گندھی) کا صندوقچہ جس سے
خوشبو کی لپٹیں آتی ہیں -

سفیدہ - لنگڑا - بمبئی - قلمی آموں کی قسمیں -

۱۹ - مری کے کام کی - مری واقع کشمیر میں کشیدہ کاری عمدہ ہوتی ہے

مندیل - رومال - دستار -

لحم خوک - سور کا گوشت - اسلام کی رو سے سور کا گوشت
حرام ہے -

۲۰ - خوجی - "فسانۂ آزاد" کا ایک کردار - یہ بڑا مسخرہ ہے - قد بہت
چھوٹا، جسم دبلا پتلا - سر چھوٹا، داڑھی چگی - کمزور
ارکھائے کی نشانی - اپنے آپ کو پہلوان سمجھتے ہیں اور
ہر جگہ پٹتے ہیں - افیون کے عادی ہیں - اور نام خواجہ

صفحہ۔ بذلہ الزماں ہے۔ لیکن یار لوگ چھیڑنے کے لئے خوجی کہتے ہیں
لاحول ولا قوۃ۔ نفرت کے موقع پر تحریر و تقریر میں استعمال
کرتے ہیں۔
دخت رز۔ انگور کی بیٹی۔ یعنی شراب انگوری۔ عام شراب
کو بھی کہدیتے ہیں۔
۲۱۔ بنت العنب۔ انگور کی بیٹی۔ یعنی شراب انگوری۔ عام
شراب بھی مراد لی جاتی ہے۔
کردم زشراب ناب توبہ میں نے خالص شراب سے توبہ کرلی ہے
یعنی میں کبھی نہیں پیونگا۔
وزکردۂ ناصواب توبہ۔ اور اپنے کئے ہوئے بُرے کاموں سے
توبہ = اس میں لطف یہ ہے کہ شراب ناب
سے توبہ کرنا خود بُرا کام تھا۔ لہذا میں نے
توبہ کرلی۔ یعنی اب میں شراب پیا کرونگا۔
مردک۔ مرد کی تصغیر۔ تحقیر کے معنی میں
شراب پی ہو ...... سور ہی کا گوشت کھا یا ہو۔
اسلام میں شراب اور سور کا گوشت دونوں حرام ہیں۔
ملاحی۔ یعنی گالی۔
۲۲۔ گلے لگاتی ہوگی۔ یعنی پی ہوگی۔
بابا آدم۔ دنیا میں سب سے پہلے مرد۔ پہلی عورت جو آدم کی بیوی
تھیں ان کا نام حوا ہے۔ ان دونوں کو شیطان کی
سازش کی بنا پر جنت بدر کرکے دُنیا میں بھیجا گیا تھا۔

صفحہ - مضی مامضی - ہوا سو ہوا۔

۲۳ - یکمشت و پنجاہ انگشت - یعنی بہت لمبی - مسلمانوں میں داڑھی رکھنا مسنون ہے۔ کہتے ہیں کہ داڑھی کی لمبائی اتنی ہونی چاہیے کہ مٹھی میں آجائے اور پھر پانچ انگل اور لمبی ہو۔ یہاں مسخرہ پن سے بجائے پانچ انگل کے پچاس انگل کہا ہے۔

از مذہبم مپرس - . . . مسافرم - میرے مذہب کے بارے میں کچھ نہ پوچھو نہ میں ایماندار ہوں نہ خدا کا منکر ہیں تو مسافر ہوں۔ اس شہر کے رسم و رواج کیا جانوں۔

شرع - مذہب اسلام -

۲۴ - بسم اللہ - (شروع کرتا ہوں) اللہ کا نام لیکر — اجازت دینے کے موقع پر کہتے ہیں۔

محرم الحرام - پاک اور مقدس محرم - محرم - چاند کے پہلے مہینے کا نام -

عیاذاً باللہ - خدا کی پناہ۔

لاحول تو آپ اپنے ہی اوپر پڑھتے ہیں - لاحول پڑھنے سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ مولوی صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آزاد خود شیطان ہے۔

بحمد اللہ - یعنی اللہ کا شکر ہے کہ

نفس لوامہ - ملامت کرنے والا نفس - یعنی ضمیر۔

صفحہ ۲۵ - قرآن اٹھانا - حلف لینا - قرآن ہاتھوں میں اٹھا کر قسم کھانا۔
برانڈی - انگریزی شراب -
۲۶ - نصیحت گوش کن ..... پیرِ دانا را = اے عزیز نصیحت سُن اس لئے
کہ جو سعادتمند نوجوان ہوتے ہیں وہ عقلمند
بڈھوں کی نصیحت کو اپنی جان سے بھی زیادہ
دوست سمجھتے ہیں -
۳۰ - عرفِ عام - عام زبان - عام بول چال -
۳۱ - کندۂ ناتراش - جاہل - غیر مہذب -
ریاضیات - حساب، جبر و مقابلہ، اقلیدس -
دینیات - مذہبی علوم -
۳۲ - علےٰ ہذا القیاس - اسی پر قیاس کرلو -
خلفائے بنی اُمیّہ - اُمیہ خاندان کے خلیفہ جو ممالک اسلامیہ کے حکمراں
تھے اور جن کا دارالخلافہ دمشق تھا - یہ وہی خاندان
ہے جسکی ابتدا معاویہ نے کی - وہ پہلے خلیفہ تھے -
ان کے بیٹے یزید نے حضرت امام حسینؑ سے
جنگ کی اور انہیں کربلا کے میدان میں شہید
کرایا -
بنی عباس - بنی اُمیہ کے بعد ممالک اسلامیہ کی عنانِ حکومت بنی عباس
کے ہاتھ میں پہنچی - اس خاندان کے بانی عباس تھے - اسی
خاندان کے ہارون الرشید اور مامون الرشید دو نہایت
مشہور خلیفہ ہوئے ہیں - خلفائے بنی عباس کا دارالخلافہ

صفحہ - بغداد تھا۔
۳۶ - اودھ اخبار۔ اُردو کا مشہور اخبار جو لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا۔
پنڈت رتن ناتھ سرشار اس کے ایڈیٹر تھے۔
خاموشی - امن و سکون - غالباً انگریزی Peace of mind
کا ترجمہ ہے۔
سر ولیم میکورتھ ینگ - پنجاب کا لفٹنٹ گورنر ۱۸۹۷ سے
۱۹۰۲ عیسوی تک۔
۳۹ - سینز - سائنسز - (Sziences)
ٹیکنیکل ایجوکیشن - (Technical Eyucatzn)
صنعتی تعلیم۔
۴۳ - زاد حشمتہ - تمہارا دبدبہ و بزرگی ترقی کرے۔
۴۵ - ماتمی لباس - سیاہ لباس ہوتا ہے۔
فاتحہ خوانی - مُردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے قرآن کا کچھ
حصہ پڑھنا۔
۴۶ - یوسفؑ - حضرت یوسف حضرت یعقوب کے بیٹے اور پیغمبر تھے۔ آپ کے
بھائیوں نے آپ سے بے وفائی کی اور آپ کو کوئیں میں دھکیل
دیا۔ لیکن آپ خدا کے حکم سے زندہ رہے۔ ایک قافلہ کے
سردار نے آپ کو کوئیں سے نکالا اور مصر میں لیجاکر بازار میں
فروخت کر دیا۔ لیکن آپ نے غلامی سے ترقی کرکے ملک مصر کی
بادشاہت پائی۔ حضرت یوسف نہایت حسین تھے۔
خُتن - تبت میں ایک مقام کا نام ہے۔ وہاں کے ہرنوں کی ناف سے

صفحہ - مشک حاصل ہوتا ہے۔

مسیحا - حضرت عیسیٰ ایک جلیل القدر پیغمبر۔ عیسائی انہیں خدا کا بیٹا کہتے ہیں مُردوں کو زندہ اور بیماروں کو تندرست کر دینا آپ کا معجزہ تھا - آپ کی الہامی کتاب انجیل ہے۔

موسیٰ - ایک زبردست پیغمبر۔ آپ نے فرعون کو شکست دیکر اپنی قوم بنی اسرائیل کو آزاد کرایا۔ آپ کی الہامی کتاب توریت کہلاتی ہے۔

یدبیضا - چمکیلا ہاتھ۔ حضرت موسیٰ نے بچپن میں ایک دہکتا ہوا انگارہ اٹھا لیا تھا جس سے آپ کی ہتھیلی میں ایک زخم ہو گیا تھا - یہ نشان عمر بھر رہا۔ جب آپ پیغمبر ہوئے تو اللہ نے آپ کو یہ معجزہ دیا کہ آپ جب چاہتے تھے ہاتھ کا وہی داغ سورج کی طرح روشن ہو جاتا تھا۔

مانی - روم کا ایک مشہور مصوّر جس نے پیغمبری کا دعویٰ کیا اور اپنے فن کو اپنا معجزہ قرار دیا۔

سحبان - عرب کا ایک نہایت فصیح شاعر۔

ابجد خواں - ابت پڑھنے والا بچہ۔

۴۹ - میر مہدی - میر مہدی مجروح - اُردو کے شاعر اور غالب کے شاگرد۔

۵۰ - قدر انداز قضا - اللہ تعالیٰ کی مرضی کا تیر انداز نشانہ کا سچا۔ یعنی خدا کی مرضی جو کبھی ٹلتی نہیں۔

لسان الغیب - غیب کی زبان یعنی غیبی رموز بتانے والی زبان - غالب نے خود اپنے کو کہا ہے۔

صفحہ ۔ ۱۲۷۷ھ والی بات غلط نہ تھی غالب نے پیشنگوئی کی تھی کہ میں ۱۲۷۷ھ
میں مرجاؤنگا ۔ چنانچہ اپنے مرنے کی تاریخ
بھی کہہ لی تھی ۔

قاطع برہان ۔ غالب کی ایک فارسی کتاب کا نام ہے جو "برہان قطع" نامی
کتاب کے جواب میں لکھی گئی ہے ۔

مجتہد العصر ۔ میر سرفراز حسین کو غالب نے یہ خطاب دیا تھا ۔

واللہ علیٰ کل شیٍ قدیر ۔ اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ۔

علی ۔ حضرت علیؓ حضرت محمد صاحب کے چچیرے بھائی اور داماد ۔
امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے والد مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ ۔

علی دارم چہ غم دارم ۔ میں علی (اسا آقا) رکھتا ہوں ۔ مجھے کیا غم ۔

۵۱ ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور
اللہ ہی طرف جانے والے ہیں ۔ کسی نقصان ۔ صدمے یا موت کی
اطلاع سُنکر پڑھتے ہیں ۔

ذی الحجہ ۔ بارھواں مہینہ قمری ۔

۵۲ ۔ مسدس ۔ ایک صنف شاعری ہے جس میں چھ چھ مصرعوں کے متعدد
بند ہوتے ہیں ۔ یہاں مسدس سے مطلب ہے ۔ مولانا
الطاف حسین حالی کا وہ مشہور مسدس جس کا نام "مدوجزر
اسلام" ہے ۔

۵۳ ۔ خطبہ ۔ مسلمانوں کی مذہبی تقریر جو ہر جمعہ کی نماز سے پہلے اور عیدین کی
نمازوں کے بعد پیش امام کرتا ہے ۔ عام تقریر کو بھی کہہ سکتے ہیں
جیسے خطبہ صدارت ۔

صفحہ ۵۴ - **مدرستہ العلوم** - یہ مدرسہ علی گڑھ میں ۱۸۷۵ء اور سر سید احمد خاں نے جاری کیا تھا۔

مرثیہ - وہ نظم جس میں کسی کی موت پر اظہار غم کیا جائے۔

حال لانا - حضرات صوفیہ محفل سرود میں حقانی نغمے سُنکر آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور بے خودی میں کبھی اُچھلنے کودنے لگتے ہیں اور کبھی بے ہوش ہو کر گر پڑتے ہیں۔ بعض اس حال میں مر بھی گئے ہیں۔ اس عالم بے خودی کو حال کہتے ہیں۔ حال لانا۔ یعنی یہ حالت طاری کرنا۔

تہذیب الاخلاق - سر سید احمد خاں کا مشہور اُردو ماہوار رسالہ۔

۵۵ - **سلام مسنون السلام** - مسنون اس عمل کو کہتے ہیں جو من جانب اللہ فرض تو نہ ہو لیکن اسے پیغمبر اسلام نے خود کیا ہو۔ اور دوسروں کے لئے بھی اسے اچھا سمجھا ہو۔ چنانچہ مسلمان کا مسلمان کو سلام کرنا پیغمبر اسلام کا اپنا یہ وہ عمل ہے۔ واضح ہو کہ "السلام علیکم" مسنون سلام ہے "آداب عرض" "تسلیمات" وغیرہ نہیں۔

مثنوی - ایک صنف شاعری ہے جس میں الگ الگ ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اوزان بھی مخصوص ہوتے ہیں اشعار کی تعداد کی حد مقرر نہیں دس بیس اشعار سے لیکر ساٹھ ساٹھ ہزار تک شعر ہو سکتے ہیں۔ اس صنف میں مسلسل مضامین خوب ادا ہوتے ہیں۔

صفحہ ۵۶ - رمضان - نواں مہینہ قمری - اس مہینے میں مسلمان روزے رکھتے ہیں۔
انشاءاللہ - مسلمان جب کوئی ارادہ ظاہر کرتا ہے تو کہتا ہے۔
مثلاً انشاءاللہ کل خط لکھوں گا -

صوم - روزہ -
۵۷ - جراحت خوردہ - زخمی یعنی مصیبت رسیدہ -
کاربن - (Carbon) ایک مادہ جو ہیرے کوئلے وغیرہ
کی شکل میں ہوتا ہے -
۵۸ - چوربالو - دلدل جو اوپر سے خشک بالو سی نظر آئے -
۵۹ - بحران - تیز بخار میں گھبراہٹ اور دماغی تغیر -
ہذیان - شدت مرض کی وجہ سے دماغ کا ماؤف ہو جانا - بڑانا
بیہودہ باتیں کہنا -
حسینؓ - امام حسینؓ حضرت علی کے بیٹے اور پیغمبر اسلام کے نواسے
تھے بنی امیہ کے دوسرے خلیفہ یزید کی فوجوں نے آپکو
میدان کربلا میں تشنہ لب شہید کردیا۔ محرم میں اسی
شہادت پر اظہار غم اور ماتم کیا جاتا ہے -
۶۲ - شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار - یہ تمثیلی مضمون ہے
تمثیلی مضمون اس مضمون کو کہتے ہیں جس میں جذبات
اور خیالات کو محسوسات کی شکل میں پیش کیا
جائے - مجرد صفات کو بھی اس طرح پیش کیا
جاتا ہے کہ ان کی جیتی جاگتی تصویریں آنکھوں
میں پھرنے لگتی ہیں -

صفحہ ۶۴ - ہاتفِ غیبی - وہ فرشتہ جو غیب سے آواز دے۔
۶۵ - بقائے دوام - ہمیشگی کی زندگی - وہ نیک نامی جو نیک اعمال کی وجہ سے ہمیشہ قائم رہے۔
آخرت - دوسری دنیا جہاں مرنے کے بعد انسانی روح پہنچتی اور اپنے کئے کا بدلا پاتی ہے۔
۶۸ - پری زاد - یعنی خوبصورت۔
دانش فریب - جو عقل کو بھی دھوکے میں ڈال دے - عقل اس کی باتوں میں آجائے اور برا بھلا نہ سوچ سکے
۶۹ - کمپاس (Compass) - پرکار۔
جرِ ثقیل - بھاری بھاری وزن اٹھانیکا آلہ۔
۷۲ - دیو ہلاک - یعنی موت۔
دل ہراساں - خوف زدہ۔
۷۴ - قوسِ قزح - دھنک - وہ رنگ برنگی کمان جو بارش کے بعد آسمان پر نظر آجایا کرتی ہے۔
حور شمائل - حور جیسی شکل صورت والی - حور جنت کی خوبصورت بڑی بڑی آنکھوں والی عورتوں کو کہتے ہیں۔
صفا آور دید - خوش آمدید۔
۷۵ - لنکا کا کوٹ - لنکا ہندوستان کے منتہائے جنوب میں ایک مشہور جزیرہ ہے - یہاں ایک نہایت مضبوط کوٹ یعنی قلعہ تھا۔
نرِ شکار مخدا۔

صفحہ ۷۶ - والمیک - سنسکرت کا زبردست شاعر جس نے رام چندر جی کی رامائن تصنیف کی -

سنہ - یعنی سنِ بکرمی - بکرماجیت کے سال جلوس سے اس کا آغاز ہوتا ہے -

۷۷ - آشیرباد - برکت دینا - دُعا دینا -

گرز گاؤ سر - ضحاک ایران کا نہایت ظالم بادشاہ تھا - اس بادشاہ کو کیانیوں سے عداوت تھی - چنانچہ وہ ان کے بچوں اور جوانوں کو قتل کرا دیتا تھا - ایک کیانی عورت حمل میں جان بچا کے بھاگی اور پہاڑوں میں روپوش ہوگئی - وہاں اسکے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اس نے فریدوں رکھا - ماں کا دُودھ سوکھ گیا تو قدرت خدا سے برمایہ نامی گائے آئی جس کے دُودھ سے فریدوں کی پرورش ہوئی - ضحاک کو بھی کسی طرح خبر لگی کہ دشمن پہاڑوں میں پرورش پا رہا ہے چنانچہ اس نے حملہ کیا - ماں کو جب خبر ہوئی تو فریدوں کو لیکے کہیں اور جا چھپی - ظالم بادشاہ کا جب کچھ بس نہ چلا تو بے گناہ گائے کو مار ڈالا - کچھ عرصے بعد ایران میں بغاوت ہوئی - ایک لوہار جس کا نام کاوہ تھا اس نے برمایہ گائے کا چمڑا نیزے پر لٹکایا اور حُبِ قوم کا علم بلند کیا - جب ایرانیوں کا ایک بڑا گروہ جمع ہوگیا تو وہ سب پہاڑوں میں گئے اور فریدوں کو اپنا بادشاہ بنا کر لائے - اس کیانی بادشاہ نے ضحاک کو قتل کر کے ایران میں کیانی عملداری شروع کی -

صفحہ - برمایہ گائے کی یاد میں گرز بنایا گیا جس کے سرے پر بجائے ہتوڑے کے آہنی گائے کا سر لگا یا گیا - یہی گرز گاؤ سر ہے - اور کاوہ کے علم کا چمڑا یعنی اسی برمایہ گائے کا چمڑا زر و جواہر سے مرصّع کیا گیا جو درفش کاویانی کے نام سے مشہور ہے۔

جہاں قدم رکھتا ہے ..... ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے رستم ایران کا بہت طاقتور اور قوی ہیکل پہلوان تھا - جب وہ چلتا تھا تو مارے طاقت کے ٹخنوں تک زمین میں دھنس جاتا تھا -

شاہان کیانی - ایران کے کیانی بادشاہ - پہلا بادشاہ فریدوں تھا - دیکھو سطور بالا میں "گرز گاؤسر"

درفش کاویانی - کاوہ لوہار کا جھنڈا - دیکھو سطور بالا میں گرزِ گاؤسر -

۷۸ - فردوسی - فارسی کا مشہور شاعر -

شاہنامہ لکھکر محروم رہا - فردوسی نے مشہور فارسی مثنوی "شاہنامہ" کا کچھ حصہ تصنیف کر کے محمود غزنوی کے حضور میں پیش کیا - بادشاہ نے اسے بہت پسند کیا - اور حکم دیا کہ تصنیف جاری رکھو - ختم ہو جانے پر فی شعر ایک اشرفی کے حساب سے معاوضہ دیا جائیگا - فردوسی نے ساٹھ ہزار شعر لکھکر مثنوی ختم کی - مگر بادشاہ نے بجائے ساٹھ ہزار اشرفیوں کے ساٹھ ہزار چاندی کے سکے دینے چاہے - فردوسی نے یہ حقیر معاوضہ قبول نہ کیا - اور غزنی سے فرار ہو گیا - اس طرح

صفحہ - وہ اپنی محنت کے معاوضہ سے محروم رہا۔

۸۰ - دارا - شاہ ایران - سکندر شہنشاہ یونان نے ملک ایران پر
فوج کشی کی اور دارا کو شکست دی۔

نظامی گنجوی - ابو محمد نظام الدین الیاس بن یوسف ترکی نظامی
تخلص - گنجہ (ایران) وطن فارسی کے مشہور
شاعر تھے - ۶۰۶ھ میں انتقال ہوا۔

خمسہ - پانچ فارسی مثنویوں کا مجموعہ جسے خمسۂ نظامی کہتے ہیں
اس کے مصنف نظامی گنجوی ہیں۔

افلاطون - ایک یونانی فلسفی سقراط کا شاگرد۔

۸۱ - جالینوس - ایک مشہور یونانی حکیم۔

سقراط - ایک یونانی فلسفی - افلاطون کا اُستاد۔

سکندر کو آئینہ دکھایا - سکندر بادشاہ یونان نے لوہے کو جلا دیکر
آئینہ بنایا تھا - اسی ایجاد کی طرف اشارہ ہے۔

طبل و دمامہ - ڈھول اور نقارہ۔

تقویم - نجومیوں کی جنتری۔

ہارون الرشید - خاندان عباسیہ کا ایک زبردست خلیفہ
دار الخلافہ بغداد تھا۔

مامون الرشید - ہارون الرشید کا بیٹا جو باپ کے بعد ممالک
اسلامیہ کا خلیفہ ہوا۔

۸۲ - ولایتی استخواں - قدی ہیکل - عام طور پر افغانی چوڑی ہڈی کے
یعنی قدی ہیکل ہوتے ہیں۔

صفحہ۔ محمود غزنوی۔ غزنی کا بادشاہ۔ اس نے ہندوستان پر متعدد حملے کیے۔

ایاز۔ محمود غزنوی کا غلام۔ محمود ایاز کے حسن صورت اور حسن سیرت کا عاشق تھا۔

۸۳۔ بوعلی سینا۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا۔ بلخ کا رہنے والا۔ زبردست حکیم اور فلسفی تھا۔ محمود غزنوی نے اُسے اپنے دربار میں بلانے کی ناکام کوشش کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں البتہ انتقال سنہ ۴۲۷ھ میں ہوا۔

انوری۔ حکیم اوحدالدین علی بن اسحٰق۔ سلطان سنجر کے عہد کا فارسی شاعر۔ متوفی سنہ ۵۵۰ھ۔

خاقانی۔ ملک الشعرا، افضل الدین ابراہیم بن علی النجار شروانی (سنہ ۵۰۰ھ۔ سنہ ۵۹۰ھ) فارسی کا مسلم الثبوت شاعر۔

ظہیر فاریابی۔ ظہیر الدین محمد بن طاہر۔ ترکستان کے ایک قریہ فاریاب کا رہنے والا۔ فارسی کا شاعر تھا۔ سن وفات ۵۹۸ ہجری ہے۔

۸۴۔ چنگیز خاں۔ تاتاری۔ بڑا ظالم اور سفاک بادشاہ۔ محمد خوارزم شاہ کو شکست دیکر بخارا، نیشاپور، سمرقند وغیرہ علاقوں کو برباد کردیا اور قتل عام سے خون کی ندیاں بہادیں۔ سنہ ۱۲۲۷ء میں ہلاک ہوا۔

۸۵۔ ہلاکو خاں۔ تاتاری۔ چنگیز خاں کا پوتا۔ اس نے خلافت عباسیہ کو ختم اور ان کے دارالخلافہ بغداد کو تباہ کیا۔ سنہ ۱۲۶۵ء میں فوت ہوا۔

صفحہ - اصطرلاب - (اسطرلاب بھی درست ہے) نجومیوں کا ایک آلہ
جس سے آسمانی اجسام کا حال معلوم ہوتا ہے۔

اقلیدس - (اقلی بمعنی کنجی + دس بمعنی ہندسہ) جیومیٹری۔

علم ہیئت - اجرام فلکی کا علم۔

رصد خانہ - جنتر منتر۔ وہ عمارات مع آلات وغیرہ کے جہاں سے
اجرام فلکی کی حرکات، موسمی تغیرات وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

محقق طوسی - خواجہ نصیر الدین محقق طوس (مشہد مقدس کا رہنے
والا تھا۔ فلسفہ، ریاضی، فقہ، حدیث، تفسیر اور
عروض وغیرہ علوم میں کامل الفن تھا۔ "اخلاق ناصری"
اس کی ایک مستند تصنیف ہے۔ سنہ ولادت ۱۲۰۰ء
اور سنہ وفات ۱۲۷۴ء ہے۔

امیر تیمور - مشہور تیمور لنگ۔ ہندوستان کے شاہان مغلیہ
کا مورث اعلیٰ۔

ابن عرب شاہ - تیموری عہد کا مورخ ہے۔ اس نے تیمور
کی بہت برائی کی ہے۔

۸۷ - طلسمات کا شیشہ بیانی - دیوان حافظ سے مراد ہے۔
حافظ شیرازی - خواجہ شمس الدین محمد بہاء الدین شیرازی۔
فارسی کے مقبول عام شاعر۔

۸۸ - شیخ سعدی - دیکھو صفحہ ۵۔
گلستان - بوستان - شیخ سعدی کی شہرہ آفاق تصانیف
فارسی۔

صفحہ - سعد زنگی - اتابک سعد بن زنگی والئی شیراز (سنہ ۱۱۹۵ء - سنہ ۱۲۲۶ء) شیخ سعدی کے والد اس بادشاہ کے دربار میں ملازم تھے - اسی وجہ سے شیخ نے سعدی کا تخلص اختیار کیا۔

چغتائی - خاندان مغلیہ ہی کو کہتے ہیں -

۸۹ - ہمایوں اسے دیکھکر شرمایا - اشارا شیر شاہ سوری تھا جس نے ہمایوں کو شکست دیکر افغانی حکومت قائم کی تھی -

مجھے اتنا فخر ... فخر کرینگے - شیر شاہ کے بنائے ہوئے ملکی قوانین پر شاہان مغلیہ نے عمل کیا - اسی طرف اشارہ ہے -

خورشید کلاہ - اکبر اعظم سے مراد ہے -

بدایونی پر خون کا دعویٰ کیا - بدایونی - ملا عبدالقادر بدایونی - اکبری مورخ - اس نے اکبر پر بہت نکتہ چینی کی ہے -

ابوالفضل اور فیضی - اکبری دربار کے درخشاں ستارے - ان دونوں بھائیوں نے اپنی تصانیف میں اکبر کی بڑی تعریف کی ہے -

مسیحائی نہ کرتی - ابوالفضل اور فیضی نے اکبر کی جو تعریف کی ہے اسی کی طرف اشارہ ہے -

۹۰ - ایک جزو کاغذوں کا - تزک جہانگیری کی طرف اشارہ ہے - یہ ایک مستند کتاب ہے جسے خود جہانگیر نے تصنیف کیا -

صفحہ ۹۱ - ایک ولائتی - یعنی نعمت خاں عالی - مرزا محمد نام - نعمت خاں خطاب
عالی تخلص - دربار اورنگ زیب کا مزاح نگار انشا پرداز
تھا۔ "وقائع نعمت خاں عالی" اس کی بہترین تصنیف
ہے۔ جس میں اورنگ زیب کی جنگ و فتح دکن پر خوب
خوب فقرے چست کئے ہیں۔

عالمگیر - اورنگ زیب۔

نعمت خاں عالی - دیکھو سطور بالا میں ایک ولائتی۔

۹۲ - گویا - بھانڈ مسخرہ - محمد شاہ رنگیلا بہت عیش پرست تھا۔
چنانچہ اس کا دربار مصنفوں اور موٴرخوں
کی بجائے ان ہی لوگوں سے بھرا تھا۔

ایک ولائتی دلاور - مراد نادر شاہ جس نے محمد شاہ کو
شکست دیکر دہلی میں قتل عام کیا۔

۹۳ - چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی - اس لئے کہ چنگیز خاں اور
نادر شاہ دونوں قتل و غارت میں یکساں تھے۔

مگر بعض پھولوں میں کانٹے - مرزا محمد رفیع سودا (صفحہ ۹)
بڑے مُنہ زور ہجو نگار بھی تھے۔

میر بد دماغی اور بے پروائی سے ...... میر تقی میر
(۱۷۲۴ء - ۱۸۱۰ء) کو محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب "آب حیات"
میں بہت بد دماغ اور مغرور لکھا ہے مگر یہ درست نہیں۔

۹۴ - درد - سید خواجہ میر درد دہلوی - (۱۷۱۹ء - ۱۷۸۵ء)
اردو کے بہترین صوفی شاعر۔

میر حسن - میر غلام حسن حسن دہلوی - (۱۷۳۶ء - ۱۷۸۶ء) اُردو کے شاعر اور مقبولِ عام مثنوی "سحر البیان" کے مصنف۔

میر انشاء اللہ خاں - انشاء دہلوی متوفی ۱۸۱۰ء

جُرأت - شیخ قلندر بخش جرأت دہلوی متوفی ۱۸۱۰ء

ناسخ - شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی متوفی ۱۸۳۸ء

آتش - خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی متوفی ۱۸۴۶ء

مومن - حکیم مومن خاں مومن دہلوی متوفی ۱۸۵۱ء

(اردو شاعر)

بانکے صاحب ضروران سے دست و گریباں ہو جانے

مرزا رجب علی بیگ سرور مصنف "فسانہ عجائب" نے میر امن دہلوی کی تصنیف "باغ و بہار" کی زبان اور طرزِ بیان پر مخالفانہ تنقید کی ہے۔

۹۹- **ریویو** (Review) تبصرہ۔ تنقید۔

۱۰۰- **مشورہ سخن** - شاعری کے فن کو حاصل کرنے کے لئے کسی سے اصلاح لینا۔

نشانِ قدم - حالاتِ زندگی۔

۱۰۲- **نیچرل شاعری** غلط ترکیب ہے - نیچر شاعری ہونا چاہیے۔ یعنی مناظرِ قدرت وغیرہ پر جو نظمیں لکھی جائیں۔

انیس - میر ببر علی انیس لکھنوی (۱۸۰۲ء - ۱۸۷۴ء) مشہور مرثیہ نگار شاعر۔

دبیر - مرزا سلامت علی دبیر لکھنوی (۱۸۰۳ء - ۱۸۷۵ء) مرثیہ نگار

صفحہ ۱۰۳ - **ولی** - ولی اورنگ آبادی (سنہ ۱۶۶۸ء - سنہ ۱۷۴۴ء) دکنی اُردو کے مشہور شاعر -

۱۰۴ - **توارد** - دو شاعروں کا ایک ہی یا مختلف زمانوں میں ایک ہی خیال کو یکساں اندازِ بیان میں ادا کرنا - اگر دیدہ و دانستہ ایسا کیا گیا تو **سرقہ ہوگا** جو شاعری کا زبردست عیب ہے - لاعلمی میں ہوا تو توارد ہے اور عیب نہیں بلکہ اتفاق ہے -

۱۰۵ - **میر** - میر تقی میر صفحہ ۳۹ -

مرزا - یعنی سودا صفحہ ۸۰ -

۱۰۷ - **میر صاحب** - غفر غینی - دریائے لطافت مصنفہ سید انشاء اللہ خاں انشاؔ میں غفر غینی اور بی نورن کی گفتگو لکھی ہے - جسے آزاد نے "آب حیات" میں نقل کیا ہے دیکھو "آب حیات" -

بی نورن - دیکھو سطور بالا میں "میر صاحب - غفر غینی" -

۱۰۸ - **اہلِ کمال کو مسخر ..... صرف کرلے" ہیں** - سید انشاء اللہ خاں انشا کی طرف اشارہ ہے - جو باوجود علم و فضل کے حصولِ معاش کے لئے مسخرہ پن سے بادشاہوں کو خوش کیا کرتے تھے - دیکھو "آب حیات"

۱۰۹ - **افصح المودبین** - ادیبوں میں سب سے زیادہ فصیح -

گریٹ ریفارمر (Great Reformer) مصلحِ اعظم

۱۱۰ - **مالیخولیا** - خللِ دماغ - ایک قسم کا جنون ہے -

فوزِ عظیم - زبردست کامیابی -

صفحہ ۱۱۱ - رمز و کنایہ - اشارہ بازی - اشاروں میں مطلب ادا کرنا -
سوانگ بنا کر سر بازار نکلنا تھا - انشا اور مصحفی کی شاعرانہ چشمکوں
اور عداوتوں کی طرف اشارہ ہے - انشا کے شاگردوں
نے مصحفی کی تضحیک کے لئے گڈے اور گڑیا کا ایک
فیل سوار جلوس نکالا تھا - دیکھو "آب حیات"

۱۱۵ - نوبل صاحب - ایک انگریز افسر ضلع تھا - غدر میں بلوائیوں نے اسے
سخت زخمی کر دیا تھا - ابن الوقت نے اس کی جان
بچائی جس کے صلے میں گورنمنٹ نے اس سے بہت
اچھا سلوک کیا -

۱۱۶ - مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست - انجام کو پہلے ہی سے سوچ لینے
والا انسان بڑا نیک بخت ہوتا ہے -

۱۱۹ - ملکہ - یعنی ملکہ وکٹوریہ - موجودہ شہنشاہ ہندوستان کے دادا
کی ماں -
الا ماشا اللہ - سوائے اس کے جسے خدا اپنے چاہے -
ڈیفنس - (Defence) طرفداری - وکالت -

۱۲۰ - چہ تواں کرد مرماں اینند - کیا کیا جائے کہ لوگ ہی ایسے ہیں -

۱۲۲ - کمپنی بہادر - ایسٹ انڈیا کمپنی - جو ہندوستان میں بغرض تجارت
آئی - اور رفتہ رفتہ یہاں انگریزی حکومت کا ڈول
ڈالا - یہ کمپنی غدر ۱۸۵۷ء تک ہندوستان پر حکمراں
رہی -

۱۲۷ - مواکلت - مسلمان اور عیسائی باہم ایک دسترخوان پر کھانا کھا

صفحہ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ کھانے میں کوئی چیز حرام نہ ہو۔

مناکحت ۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں بغیر اپنا اپنا مذہب تبدیل کئے بیٹی بیوہار ہو سکتا ہے۔

۱۲۸- تعزیہ داری ۔ محرم میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر ماتم کرنا۔

۱۲۹- مشرک ۔ جو شخص سوائے خدا کے کسی اور کو بھی معبود سمجھے۔

ہتیارہ ۔ ظالم۔

بھرشٹ ۔ ناپاک۔

چربی کے کارتوس ۔ غدر سے پہلے ٹوپی دار بندوقوں کے لئے ایک خاص قسم کے کارتوس بن کر آتے تھے۔ جن پر سیل سے بچانے کے لئے چربی لگا دی گئی تھی۔ بندوق میں بھرنے سے قبل کارتوس کا بارود والا سرا دانتوں سے توڑنا پڑتا تھا۔ مسلمان اور ہندو فوجیوں میں ان کارتوسوں کی وجہ سے ایک ہیجان پیدا ہوا۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ سور کی چربی ہے ہندوؤں نے سمجھا کہ گائے کی ہے سور کی اور گائے کی نہ بھی ہو تب بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کے نزدیک ناپاک تو ضرور ہی تھی۔

۱۳۱- چھوئی موئی ۔ ایک پودا ہوتا ہے۔ اسے اگر کوئی چھوئے تو اس کے پتے اور شاخیں ایسی کملا جاتی ہیں گویا وہ پودا مر گیا لیکن تھوڑی دیر میں وہ پھر بدستور لہلہانے لگتا ہے۔

صفحہ۔ جن چیزوں سے مسلمانوں کو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کو بھی نہیں چھوڑتے۔ یعنی شراب اور سور کے گوشت کو۔

۱۳۲۔ کرستان ۔ کرسچین ۔ عیسائی۔

گڑھے سے جو ہرے تو نہر کیوں دو ۔ یہ پنڈت دیا شنکر کول نسیم لکھنوی کی مشہور مثنوی گلزار نسیم کا ایک مصرع ہے جو اب ضرب المثل بن گیا ہے۔

۱۳۴۔ معابد ۔ جمع معبد ۔ عبادت گاہ ۔ مسجد، مندر وغیرہ۔

۱۳۵۔ طفل بہ مکتب نمی رود ولے برندش ۔ بچہ مدرسہ خود نہیں جاتا بلکہ اُسے بھیجا جاتا ہے۔

۱۳۶۔ غایت مافی الباب یہ کہ ۔ اس بارے میں اصل مقصد یہ ہے کہ

۱۳۷ پارلیمنٹ (Parliament) دارالحکومت ۔

علیٰ سبیل البدلیت ۔ یکے بعد دیگرے ۔

۱۳۸۔ ڈسپاٹک ۔ (despotic) شخصی ۔ خود مختار ۔

تہی دستانِ قسمت ۔ ۔ الخ، تقدیر کے ہیٹوں کو رہبر کامل سے بھی کچھ منافع نہیں پہنچتا حضرت خضر جیسے بزرگ کی رہبری سکندر کے کام نہ آئی اور وہ آبحیات کے چشمے سے پیاسا ہی لوٹ آیا۔

سقیم الحال ۔ بدحال ۔ مفلس ۔

با اقسامہم ۔ مع اپنی دوسری قسموں کے ۔

۱۳۹ جمع ۔ لگان کی آمدنی ۔

تقاوی ۔ وہ مالی امداد جو حکومت بطور قرضہ کے کاشتکاروں

صفحہ۔ کو زراعت کی درستی کے لئے دے۔
افتادہ۔ وہ زمین جو کاشت نہ ہو سکی ہو۔
کاغذات دیہی۔ گاؤں کے متعلق کاغذات اور رجسٹر وغیرہ
جو پٹواریوں کی تحویل میں رہتے ہیں۔
۱۴۲۔ الاتفاق قوت۔ ایکے میں طاقت ہوتی ہے۔
۱۴۴۔ سانواں کودوں۔ ایک قسم کا خودرو غلہ۔ دیہاتی اسے پکا کر
کھاتے ہیں۔
بنی اسرائیل۔ اسرائیل یعنی حضرت یعقوب کی اولاد۔ اس قوم
سے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسےٰ تھے۔
من وسلویٰ۔ ایک قدرتی خوراک جو بنی اسرائیل کو بلا کسی محنت
ومشقت کے ملا کرتی تھی۔
ستو باندھ کر۔ اودھ کے مفلس دیہاتی ستو زیادہ استعمال کرتے
ہیں۔ کہیں سفر میں جانا ہوا تو چادر یا رومال کے
گوشے میں ستو باندھ لیا اور چل دئے۔ جہاں بھوک
لگی اسی چادر کے گوشے میں ستو گوندھ لیا اور
نمک ڈال کر کھا لیا۔
مجوّز جمع۔ زمین کا لگان تجویز یا مقرر کرنے والا۔
۱۴۶۔ گدگدی۔ شوق۔
۱۴۸۔ یوماً فیوماً۔ روز بروز۔
۱۵۰۔ بئے (Bay) کتھیا۔
چرٹ۔ سیگار

صفحہ ۱۵۲- سیولیزیشن (Civilization) - تہذیب -

۱۵۵ - اسٹامپ (Stamp) عدالت کی رسوم کے ٹکٹ -

طلبانہ - وہ رقم جو عدالت مدعی یا مستغیث سے وصول کرکے گواہوں وغیرہ کو خرچ کے طور پر ادا کرتی ہے -

محنتانہ - وہ رقم جو وکیل اپنے موکل سے اجرت کے طور پر وصول کرتا ہے -

۱۵۶ - حلف - قسم کھانا - گواہ عدالت کے روبرو خدا کو حاضر و ناظر جانکر کہتا ہے کہ جو کچھ میں کہونگا وہ سچ ہوگا -

امراض خبیث - برے اور گھناونے امراض مثلاً کوڑھ وغیرہ -

۱۵۷ - ام الخبائث - تمام برائیوں کی ماں یعنی شراب -

۱۶۱ قریش مکہ - عرب کے مشہور اور متبرک شہر مکہ کا ایک ممتاز قبیلہ پیغمبر اسلام اسی قبیلہ کے جوہر فرد تھے -

۱۶۲ - کعبہ - مکہ میں مسلمانوں کا متبرک مقام -

ہجرت - پیغمبر اسلام نے اپنے ہموطنوں اور رشتہ داروں کے مظالم سے تنگ آکر اپنا وطن مکہ چھوڑ دیا تھا - وطن کی اس جدائی کو ہجرت کہتے ہیں - اسی تاریخ سے سنہ ہجری شروع ہوتا ہے -

بدر - نام ایک مقام کا عرب میں - جہاں پیغمبر اسلام نے کفار سے کامیاب جنگ کی تھی -

۱۶۶ - معقولات - فلسفہ -

منقولات - مذہبیات -

صفحہ ۱۶۹- نابغہ دبیانی - ایک عرب شاعر۔
اشعر الناس - بہترین شاعر۔
حسان بن ثابت - عرب شاعر و ادیب -
۱۷۰- عباسیہ - خلفائے بنی عباس (دیکھیے صفحہ ۳۲)
۱۷۲ جاہلیتہ - عرب میں پیغمبر اسلام کے ظہور سے قبل کے زمانے
کو زمانۂ جاہلیت کہتے ہیں -
۱۷۳- شاہ حجاز - مراد حضرت امام حسینؑ -
۱۸۱- قصیدہ - ایک صنف شاعری - ظاہری ہئیت غزل کی ہوتی ہے
فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ قصیدے کے اشعار کی تعداد
مقرر نہیں - قصیدہ میں عام طور پر کسی کی مدح کی جاتی ہے
بُرائی بھی کی جا سکتی ہے جسے ہجو کہتے ہیں -
عُکاظ کا میلہ - عُکاظ عرب میں ایک مقام کا نام ہے جہاں میلہ
بھرا کرتا تھا - اور شعرا آ کر وہاں اپنا کلام سُنایا
کرتے تھے -
۱۸۲- سبعہ معلقہ - جاہلیت میں یعنی پیغمبر اسلام سے قبل عرب کے
فصیح اور بلیغ سات شاعروں نے اپنا اپنا ایک
ایک قصیدہ یعنی کل سات قصیدے کعبہ کے
دروازے پر فخریہ لٹکا دئے تھے تاکہ لوگوں پر
ان کا کمال ظاہر ہو - سبعہ یعنی سات اور معلقہ
یعنی لٹکے ہوئے -
۱۸۸- لوح سادہ پر لئے ہر نقش آمادہ - سادہ اور بن لکھی تختی

صفحہ - جس پر جو چاہو لکھدو۔
۱۸۹- مقناطیس - ایک پتھر جو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔
۱۹۰- حکم ناطق - حکم جس کی خلاف ورزی نہ کی جاسکے۔
۱۹۵- کیمسٹری - علم کیمیا۔
کتاب مقدس - متبرک مذہبی کتاب - مثلاً قرآن - انجیل
بید وغیرہ۔
۱۹۷- ملاذ و ماوے - جائے پناہ - اور جائے باز
گشت۔
۲۰۱- خطبۂ نکاح - نکاح میں ایجاب وقبول سے قبل قرآن
کی مخصوص آیات پڑھی جاتی ہیں۔
۲۰۲- پاپڑ بیلنا - مصیبت جھیلنا۔
آؤ بھگت - خدمت کرنا۔
للّو پتّو - خوشامد درآمد کرنا۔
۲۰۵- اللہ آمین - دعائیں اللہ سے مانگی جاتی ہیں - اور دعاؤں
کے بعد آمین" (خدا ایسا ہی کرے) کہا جاتا
ہے۔ اللہ آمین کی چیز سے مراد ہے - وہ جسکے
لئے دعائیں مانگی گئی ہوں - یعنی بڑی آرزوؤں
اور تمناؤں سے حاصل ہوئی ہو۔
۲۰۶- یوم الحساب - روزِ حساب، روز قیامت جس
روز خدا سب کے اعمال کو جانچ کر
سزا یا جزا دیگا۔

صفحہ حقیقی بادشاہ یعنی خدا۔

۲۰۷ پروانہ ہونا ۔ عاشق ہونا ۔ قربان ہونا ۔

تسبیح کرنا ۔ خدا کی حمد کرنا ۔ عبادت کرنا ۔

۲۱۳ راجہ رام موہن رائے ۔ پیدائش ۲۲ مئی ۱۷۷۲ء ۔ مولد رادھانگر ضلع ہگلی ۔ بنگال ۔ وفات لندن ۲۷ ستمبر ۱۸۳۳ء
ہندوستان کا ایک مشہور لیڈر

سوامی دیانند سرسوتی ۔ مشہور و معروف بانی آریہ سماج ۔

مسٹر رینڈے ۔ مہادیو گووند رینڈے ۔ پیدائش پونا ۔ ۱۸ جنوری ۱۸۴۲ء ۔ وفات ۱۶ جنوری ۱۹۰۱ء
مشہور سیاسی اور تعلیمی مصلح ۔

صور ۔ مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق ۔ ایک بڑا بگل جس کو اسرافیل نامی فرشتہ قیامت کے دن پھونکے گا ۔ ایک مرتبہ کل مخلوق کو مار ڈالنے کے لئے اور دوسری دفعہ سب مخلوق کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ۔

سر سریندر ناتھ بنرجی ۔ پیدائش کلکتہ ۱۸۴۸ء ہندوستان کے مشہور مقرر اور لیڈر ۔ آپ کانگریس کے دوبارہ صدر بنائے گئے ۔ اول ۱۸۹۵ء میں اور دوسری بار ۱۹۰۲ء میں

دادا بھائی نوروجی ۔ پیدائش بمبئی ۱۸۲۵ء آپ نے کانگریس کے تین جلسوں کی صدارت کی ۔ پہلی مرتبہ ۱۸۸۶ء میں دوسری مرتبہ ۱۸۹۳ء اور

صفحہ - تیسری دفعہ ۱۹۰۶ء میں -

۲۱۳ - سر سید احمد خاں - مختصر حالات زندگی دیکھو صفحہ

۲۱۵ - کانگریس - انڈین نیشنل کانگریس - مسٹر اے - او - ہیوم پنشنر سویلین کی کوشش سے ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی اور اس کا پہلا جلسہ دسمبر ۱۸۸۵ء میں زیر صدارت ڈبلیو سی - بونرجی بمقام بمبئی منعقد ہوا -

۲۱۷ - تیرہ خاکداں - یعنی تاریک سرزمین - یعنی جہالتوں اور بدبختیوں سے بھرا ہوا ملک -

پولیٹکل معرکہ آرائی - سیاسی مخالفت - الگ الگ پارٹیوں کا الگ الگ مقاصد کے لئے باہم مخالفت کرنا -

خوں آشام - لفظی معنی خون پینے والی - جنگجوئی مراد ہے -

۲۱۸ - دہلی کی گذشتہ عظمت ...... جل رہی تھی - شاہانِ مغلیہ کی شان و شوکت کے مٹتے ہوئے نشان لال قلعہ دہلی سے نمایاں تھے - مطلب یہ ہے کہ خاندان مغلیہ کے آخری مگر بے زور بادشاہ ابھی برسرِ حکومت تھے -

اودھ میں نوابی دور .... تھا - یعنی لکھنؤ میں ابھی نوابوں کی حکومت برقرار تھی -

کانگریس کا خیال خواب ..... پیدا ہوا تھا - یعنی ابھی انڈین نیشنل کانگریس قائم نہیں ہوئی تھی -

۲۱۹ - بدر الدین طیب جی - پیدائش بمبئی ۸ اکتوبر ۱۸۴۴ء وفات

صفحہ - لندن ۱۹ اگست ۱۹۰۶ء - ہندوستان کا ایک مشہور سپوت - آپ نے کانگریس کے تیسرے اجلاس جو ۱۸۸۷ء میں بمقام مدراس منعقد ہوا - صدارت کی -

رومیش چندر دت - پیدائش ۱۸۴۸ء - وطن کلکتہ - مشہور مصنف اور محقق -

پروفیسر گوکھلے - آنریبل مسٹر گوپال کرشنا گوکھلے - پیدائش کوٹھاپور ۱۸۶۶ء - انتقال ۱۹۱۵ء ہندوستان کی مشہور ہستیوں میں سے تھے - آپ نے ۱۹۰۵ء میں کانگریس کی صدارت بھی کی ہے یہ اجلاس بنارس میں ہوا تھا -

کالی چرن بنرجی - ایک مشہور ہندوستانی مصلح اور لیڈر -

۲۲۰ - **نور اللہ مرقدہ** - اللہ ان کی قبر کو روشن کرے -

۲۲۲ - **پائنیر** - انگریزی اخبار - پہلے الہ آباد سے شائع ہوتا تھا اب لکھنؤ سے نکلتا ہے - برٹش راج کی خیر خواہی اس کی پالیسی ہے - اسی وجہ سے اسے "کافر" کہا گیا ہے -

شیخ سعدی - دیکھو صفحہ

اگر شہ روز را . . . الخ اگر بادشاہ وقت دن کو رات کہے تو اس کے ملازموں کو اس کی ہاں میں ہاں ملانی چاہئے - وہ دن کو رات کہے تو کہنا چاہیے کہ یہ چاند چمک رہا ہے اور دیکھئے وہ پروین ٹمٹما رہی ہے

صفحہ
۲۲۳- دادا بھائی کے ایسے۔ لکھنؤ کی زبان ہے دہلی والے دادا بھائی سا یا دادا بھائی جیسا بولتے ہیں۔
نواب سلیم اللہ۔ نواب سلیم اللہ خاں صاحب بہادر نواب ڈہاکہ۔ آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے بانی تھے۔ آپ کی تحریک سے مسلم لیگ قائم ہوئی اور اس کا پہلا اجلاس سنہ ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈہاکہ ہوا۔ آپ نے سنہ ۱۹۱۷ء والے اجلاس کی صدارت بھی کی۔
الہیٰ آفتاب دولت درخشاں باد۔ اے خدا حکومت کا سورج چمکتا رہے۔
لارڈ منٹو۔ ہندوستان کا گورنر جنرل۔ (سنہ ۱۹۰۵-۱۰ء)
نواب محسن الملک۔ سرسید احمد خاں کے رفقا میں ایک قابل قدر ہستی۔ اُردو انشا پرداز۔ اور مسلمانوں کے ریفارمر آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے یعنی سنہ ۱۹۰۶ء والے اجلاس میں آپ لیگ کے جوائنٹ سکرٹری مقرر ہوئے تھے۔
۲۲۹- سقوط۔ گر پڑنا مراد ہے اورنہ کے دشمن کے ہاتھوں فتح ہونے سے۔
۲۳۰- جامع سلیم۔ نام مسجد واقع ایڈریا نوپل۔
سجدہ ہائے نیاز۔ یعنی نماز۔
زمزمہ ہائے توحید۔ خدا کے ایک ہونے کے نغمے یعنی اذان۔
تکبیر۔ اللہ اکبر کہنا۔
اعلان وشہادت توحید کی ایک صدا۔ یعنی اذان
قضا ہونا۔ وقت کا ٹل جانا۔

صفحہ
۲۳۱ - بیت جلیل خلیل اللہ۔ جلیل اللہ یعنی حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا مقدس و بزرگ مکان۔ مراد خانہ کعبہ سے ہے جو مکہ میں واقع ہے۔

مسجد مطہرہ رسول اللہ۔ پیغمبر اسلام کی مقدس مسجد۔ مدینہ میں ہے۔

ملاعنہ صلیبیا - مراد عیسائی۔

۲۳۲ - گنبد سبز - پیغمبر اسلام کے مزار مبارک پر جو گنبد ہے اس کا رنگ سبز ہے۔

دنیا کا سب سے بڑا انسان - یعنی حضرت محمدؐ۔

۲۳۴ - نزع اکبر - طامۃ الکبریٰ — قیامت۔

وقت موعودہ اور مصیبت منتظرہ - قیامت۔

خاک بدہنم - میرے منہ میں خاک۔

۲۳۵ - ریوٹر - انگلستان کی ایک خبر رساں ایجنسی۔

۲۳۶ فی انفسکم افلا تبصرون - تمہارے دلوں میں ہے مگر تم دیکھتے نہیں۔

۲۴۰ - بہادر شاہ - خاندان مغلیہ کا آخری بادشاہ۔

۲۴۱ صاحب عالم - خاندان مغلیہ کے شاہزادوں کو اسی طرح مخاطب کیا جاتا تھا۔

دھان پان - دُبلا پتلا - کمزور۔

۲۴۶ - سحری - مسلمان جس روز روزہ رکھتا ہے اس روز صبح صادق سے پہلے کچھ کھا پی لیتا ہے - اسی کو سحری کہتے ہیں۔

۲۴۸ - عدت - لفظی معنی شمار - گنتی - مگر اصطلاح میں اس مدت

صفحہ۔ کو کہتے ہیں جس میں عورت بیوہ ہو کر اپنے مرحوم شوہر کا ماتم کرتی ہے۔ یہ مدت چار ماہ اور دس روز ہے۔ اس مدت میں عورت کہیں آجا نہیں سکتی۔ مطلقہ کے لئے بھی عدت ہے جسکی میعاد تین ماہ ہے۔ اگر مطلقہ دوسرا نکاح کرنا چاہے تو وہ مدت کے بعد ہی کر سکتی ہے۔ اس دوران میں نہیں۔

۲۴۳ مدرسۃ العلوم۔ علی گڑھ میں سرسید احمد نے قائم کیا۔

۲۴۴۔ علیگ۔ علی گڑھ کا مخفف۔ جو شخص علی گڑھ کا تعلیم یافتہ ہوتا ہے اس کے نام کے بعد لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً فلاں۔ بی۔ اے (علیگ)

ذاکر۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ جامعہ ملیہ دہلی کے بانی پرنسپل۔

۲۴۷۔ روحِ نشاط۔ اصغر گونڈوی کے کلام کا پہلا مجموعہ۔ دوسرا مجموعہ "سرودِ زندگی" ہے۔

۲۴۹ متاعِ یوسفی۔ خود حضرت یوسف یا آپ کا حسن۔

دام تو مصر ہی کے بازار میں لگیں گے۔ حضرت یوسف کو مصر کے بازار میں فروخت کیا گیا تھا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۵۱ بلالی۔ حضرت بلالؓ پیغمبر اسلام کے فدائیوں اور عاشقوں میں سے تھے۔

بولہبی۔ ابولہب یوں تو پیغمبر اسلام کا چچا تھا۔ مگر بڑا ظالم۔ اس نے آخر دم تک اسلام قبول نہیں کیا۔ اور پیغمبر صاحب کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔

صفحہ ۲۵۲ فرشتہ کو شیطان ہو جاتے بھی تو آپ نے سُنا ہو گا
شیطان پہلے ایک جلیل القدر فرشتہ تھا۔ حضرت آدم کو سجدہ نہ کرکے اس نے خدا کی حکم عدولی کی۔ اس کی پاداش میں اسے جنت سے نکال دیا گیا۔ اور اب وہ شیطان ہے۔ اور لوگوں کو بہکاتا پھرتا ہے۔

۲۵۳ - اکیڈمی ۔ ہندوستانی اکیڈمی (الہ آباد) گورنمنٹ نے اس ادارہ کو اردو اور ہندی ادب کی ترقی کے لئے قائم کیا ہے۔ اصغر گونڈوی اس اکیڈمی کے اردو سہ ماہی رسالہ "ہندستانی" کے ایڈیٹر تھے۔

۲۵۷ - ہومیو پیتھک ۔ ایک طریقہ علاج ہے۔

۲۵۸ - فتوحات ۔ مراد ہے نذرانہ سے یا وہ چیز جو مفت ہاتھ لگے۔

سیمیائی ۔ نظر بندی جس میں عامل معمول کو موہوم تصاویر دکھا دیتا ہے۔

۲۶۳ - بلڈ پریشر ۔ خون کا دباؤ۔ فالج کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

۲۶۹ - جامعہ ملیہ ۔ ایک قومی و اسلامی کالج و یونیورسٹی۔ یہ دہلی میں واقع ہے۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین اس کے بانی اور پرنسپل ہیں۔

زلا تسخیر کر دم الخ میں نے لا یعنی عدم کہہ کر چاند اور ستاروں کی اس دنیا کو فتح کر لیا ہے۔ اور اپنے بندگی اور عبادت کے جوش اور ذوق و شوق سے ایک

صفحہ - پروردگار یعنی خدا دریافت کرلیا ہے۔
(مسلمانوں کا کلمہ لا سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی لا الہ الا اللہ
یعنی نہیں ہے کوئی خدا اگر وہ خدا - یعنی پہلے انکار کیا
کہ نہیں ہے کوئی خدا - اور پھر اس انکار کے دریا سے مقصد
کا موتی نکال لیا)

۲۷۰ جگر - علی سکندر جگر مراد آبادی - مشہور اردو غزل گو - آپ کے
کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں - (۱) داغ جگر -
(۲) شعلۂ طور -

۲۷۳ - براہیم - حضرت ابراہیمؑ - آپ کے والد بت تراش تھے -
لیکن آپ ان کے بنائے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالا
کرتے تھے - لہذا بت شکن مشہور ہیں - یہاں یہ
مطلب ہے کہ اگر سجاد انصاری کچھا ور جیتے ہوتے
تو اپنے جدید ادب سے اکثر اردو ادیبوں کے دعوئ
انشا پردازی کی قلعی کھول دیتے - اور ان کے بت
پندار کو توڑ ڈالتے -

سر سپرو - سر تیج بہادر سپرو، الہ آباد کے سربرآوردہ وکیل
اور قومی لیڈر - آپ کو اردو زبان وادب سے
خاص لگاؤ ہے -

پنڈت کیفی - پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی - آپ انجمن ترقی
اردو میں اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں - شاعر
اور انشا پرداز ہیں - اور اردو کے علمبردار -

صفحہ

۲۷۵ - اقبال - ڈاکٹر شیخ محمد اقبال مرحوم - بانگ درا وغیرہ کے مصنف - اُردو کے مایۂ ناز شاعر -

حاتم طائی - ویسے تو ایک عرب شہزادہ تھا - جو بہت سخی تھا لیکن یہاں مُراد ہے - اسی نام کی کتاب کے ہیرو سے - اس نے منیر شامی نامی شہزادے کی مدد کے لئے سات سفر کئے تھے -

کوہ ندا - حاتم طائی نے ایک سفر کوہ ندا کی حقیقت دریافت کرنے کے لئے کیا تھا - یہ ایک پہاڑی قلعہ تھا جس سے ایک آواز آتی تھی - قریب والی آبادی سے کوئی ایک شخص جسکی باری ہوتی ہوگی وہ اس آواز کو سُنکر بے اختیار قلعہ کی طرف دوڑتا تھا - اور اس میں داخل ہوکر عمر بھر کے لئے غائب ہو جاتا تھا -

۲۷۶ - جدید اسکول - زمانہ موجودہ میں بعض اُردو شعرا اور بار اُردو شعر و ادب کو ایک خاص جدید رنگ میں پیش کر رہے ہیں - اس جدید رنگ کی خصوصیات یہ ہیں - جملہ قیود ادب سے انحراف - جملہ قیود اخلاق سے آزادی - جملہ سماجی علّتوں کا علاج خصوصاً مفلسی کا انسداد وغیرہ -